بانو کی کہانیاں
بانو ارشد

رو میں ہے رخش عمر

نام	: بانو ارشد
خاندانی نام	: شہر بانو ارشد
والد	: محترم ارشد تھانوی
والدہ	: محترمہ خاتون ارشد
اولاد	: ندیم احمد، تزئین احمد، فہیم احمد
تعلیم	: ایم۔اے (1959ء- کراچی یونیورسٹی)
	بی ایڈ (1961ء- کراچی یونیورسٹی)
	ڈپلوما ان ایجوکیشن (1982ء- لندن یونیورسٹی)
تصانیف	: 1- بانو کے افسانے (21 افسانوں پر مشتمل)
	2- بانو کی کہانیاں (22 افسانوں پر مشتمل)
زیر طبع	: مجموعہ مضامین
سیاحت	: امریکہ، کینیڈا، عراق، ایران، ترکی، سعودی عرب، کویت، شام، ہندوستان، نائجیریا، مصر، کینیا، ناروے، ہالینڈ، فرانس، جرمنی، آسٹریا، سوئٹزرلینڈ اور لکسمبرگ

"بانو کی کہانیاں" جیسا کہ نام سے ظاہر ہے بانو ارشد کے افسانے اور کہانیاں ہیں۔ وہ برطانیہ میں مقیم ہیں۔ ان کے افسانے پاکستان سے باہر رہ کر لکھنے والوں کے افسانوں کے موضوعات سے قریب تر ہیں جو ایک فطری بات ہے۔ پاکستانیوں اور ہندوستانیوں کی ایک معتدبہ تعداد باہر کی دنیا جاکر آباد ہوگئی ہے اور دوسرے سماج میں گھلنے ملنے سے جو معاشرتی اور تہذیبی مسائل پیدا ہوتے ہیں اور جس قسم کے دکھ اور مصائب انسان کا مقدر بنتے ہیں' اس کا موثر احاطہ بانو ارشد صاحبہ نے اپنے افسانوں میں کیا ہے اور عورت کی تقدیر کے حوالے سے چند سوالات بھی اٹھائے ہیں۔ واضح رہے کہ بانو ارشد برصغیر کی مشہور و معروف تھانوی فیملی سے تعلق رکھتی ہیں' لہٰذا پڑھنا لکھنا ان کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ اس طرح بانو ارشد نے اپنے خاندان کی تہذیبی روایت کو آگے بڑھایا ہے۔

بانو ارشد کی کہانیوں یا یوں کہئے کہ افسانوں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان میں تاثیر ہے۔ وہ جس موضوع کو سوچتی ہیں' اسے سیدھے سادے اسلوب میں مگر جہات کے ساتھ برتتی ہیں۔ ان کے افسانے پڑھ کر انسان کچھ نہ کچھ سوچتا ضرور ہے۔ خاص طور پر ان گنت مسائل کی دنیا میں گھرا ہوا قاری ہر افسانے میں ایک حقیقت کے ماجرے کی تفہیم سے اپنے ادراک میں اضافہ کرتا ہے۔

حمایت علی شاعر نے "پس منظر" کے عنوان سے جو مضمون لکھا ہے' اس میں شوہر یا مجازی خدا اور مرد شاؤنیت Chauvinism کا تذکرہ کیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ روز ازل سے لے کر آج تک مرد اور عورت کے تعلقات میں کھنچاؤ چلا آرہا ہے۔ خود مغرب کے آزاد معاشرے میں بھی عورت مرد کے ہاتھوں پٹائی' سردمہری اور ظلم کی شکایت کرتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ مسئلہ انتہائی گمبھیر اور سنگین ہے۔' اسے پروپیگنڈے سے ہٹ کر معروضی انداز سے دیکھنے کی ضرورت ہے اور آج یہ بتانے کی ضرورت بھی ہے کہ دونوں کے درمیان یہ کشیدگی کس طرح ختم ہوسکتی ہے۔

ڈاکٹر ممتاز احمد خان

بانو کی کہانیاں

بانو ارشد

انتساب

بھائی جان

سلمان الارشد

اور

بھائی صاحب

سلطان الارشد

کے نام

بانو ارشد نے مشرقی تہذیب کے پس پردہ خاموش المیوں کی حقیقی تصویر کشی کی ہے۔

حمایت علی شاعر

بانو ارشد کی کہانیوں میں حقیقت نگاری کا عنصر سامنے آرہا ہے اور اس مجموعے کی کہانیوں کے مطالعے سے ان کا ذہنی سفر اور خوب سے خوب تر کی سعی و پیہم کا اچھا اندازہ ہوجاتا ہے۔

قیصر تمکین

بانو ارشد کے افسانوں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ قابل مطالعہ ہیں۔ بانو کے افسانے تحریر کی اسی خوبی کے باعث پڑھنے والوں سے مکالمہ کرتے ہیں۔ اور جو تحریر مکالمہ کرتی ہے وہ بہت عرصے تک تازہ رہتی ہے۔

سلطان جمیل نسیم

بانو کے افسانوں میں عورت کا کردار بہت توانا اور مستحکم ہے۔

نیر جہاں

مغرب میں آباد ایشیائی عورتوں کے مسائل کو بانو نے خوبصورتی سے تحریر کیا ہے۔

مقصود الٰہی شیخ

جب آدمی نیا نہیں ہے تو کہانی کس طرح نئی ہوسکتی ہے۔ آدمی سے پہلے اس کی کہانی جنم لے چکی تھی۔ یہ تو آدمی ہی تھا جس نے اپنی کہانی مستقبل تک پہنچائی۔ کہانی کو تجریدی کہو، علامتی کہو، مزاحمتی کہو، کہانی کی نفی کرنے والی کہانی کہو یا جدید اور جدید تر کہو--- سچ تو یہ ہے کہ کہانی صرف کہانی ہوتی ہے۔ آج نہیں تو کل یہ ساری اضافتیں بھلا دی جائیں گی اور صرف کہانی یاد رکھی جائے گی..... بانو ارشد کی ان چند کہانیوں نے میرے اس یقین کو استحکام دیا ہے، ان کہانیوں کا یہی کمال ہے۔

امراؤ طارق

فہرست

افسانے

تاثرات (بانو کے افسانے)

مشکور حسین یاد

بانو کی کہانیاں

"بانو کی کہانیاں" کے چند افسانے میں نے پڑھے ہیں۔ مجھے ان افسانوں کو پڑھ کر پہلی خوشی یہ ہوئی کہ ان میں ہر جگہ بانو کی شخصیت کی موجودگی کا بھرپور احساس ہوتا ہے۔ بانو جس طرح اپنی عام زندگی میں بہت کم تکلف سے کام لیتی ہیں' اسی طرح ان کے افسانوں کی پہلی خوبی ہی آپ کو ان کی بے ساختگی اور بے تکلفی ہی میں نظر آئے گی۔ اس حقیقت سے کون واقف نہیں کہ ہر صنف ادب کے چند اصول ہوتے ہیں' جن کے مجموعہ کو اس صنف کی تکنیک کہا جاتا ہے لیکن آپ اس حقیقت سے بھی اچھی طرح واقف ہوں گے کہ صنف ادب پہلے وجود میں آتی ہے اور اس کے اصول یا تکنیک بعد میں ظہور میں آتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ کسی صنف ادب کی تکنیک اور اصول و قواعد کوئی حرف آخر نہیں ہوتے' لکھنے والا اس میں حسب توفیق ردوبدل بھی کر سکتا ہے اور ان میں اضافہ کا باعث بھی بن سکتا ہے۔

بانو نے اپنے افسانوں میں عام طور پر کچھ اپنی ہی تکنیک استعمال کی ہے۔ اس سے میرا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ بانو نے اس ضمن میں روایت سے کوئی بغاوت کی ہے۔ بانو کی شخصیت میں جب کوئی باغیانہ پن ہی نہیں ہے یا وہ کہیں دور دور سے بھی باغی نظر نہیں آتیں تو وہ روایت سے کیا بغاوت کرتیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ وہ روایت کی لکیر کی فقیر بالکل نہیں ہیں-----اور جہاں روایت کو برقرار بھی رکھا ہے تو اس میں ایک رکھ رکھاؤ موجود ہے۔ مثال کے طور پر میں یہاں ان کے دو افسانوں کا ذکر کروں گا۔ پہلا افسانہ "آواز" اور دوسرا "ایسا بھی ہوتا ہے" ہے۔

آپ دیکھیں گے "آواز" اپنے تاثر کے اعتبار سے ایک عمدہ کہانی ہے' اس میں افسانہ کی مروجہ تکنیک میں سے کوئی تکنیک استعمال نہیں کی گئی لیکن اس میں پھر بھی ایک تکنیک

ہے۔ اس کہانی کی ہیروئن آسیہ کا تعارف کراتے ہوئے بانو ارشد لکھتی ہیں ''حسن نام کی کوئی شے بھی اس کو چھو کر نہ گئی تھی مگر اس کے معصوم چہرہ پر حوروں جیسا تقدس تھا'' ـــــ گویا حسن کا تعلق محض جسم اور اس کے خدوخال سے نہیں، انسان کا کردار بھی ایک انوکھا حسن رکھتا ہے، جس کو ہم لوگ عموماً ''تقدس کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ آسیہ صومالیہ سے لندن آئی ہوئی ایک ستم رسیدہ لڑکی ہے، جس کی ماں کو صومالیہ میں مار دیا گیا تھا۔ باپ کو فوجی پکڑ کر لے گئے، بھائی بھی لاپتا ہے۔ آسیہ اپنی خالہ کے گھر لندن آئی ہوئی ہے۔ افسانہ نگار اس کی ٹیچر ہے۔ اس کو غم زدہ دیکھ کر اس کے حالات سے آگاہی حاصل کرتی ہے۔ یہ لڑکی اپنے حالات بتانے سے قبل ہماری کہانی نگار کو ایک بڑا **چبھتا** ہوا جملہ کہتی ہے ''مس میری تو کہانی بہت دردناک ہے اس کے لئے روشنائی نہیں خون کے آنسوؤں کی ضرورت ہے۔'' یعنی وہ لڑکی کہہ رہی ہے کہ آپ میرے ساتھ زیادہ سے زیادہ یہ ہمدردی دکھائیں گی کہ ایک افسانہ لکھ دیں گی ـــــ بہرحال یہ ساری دکھ بھری کہانی، کہانی نگار نے بے کم و کاست لکھ ڈالی ہے لیکن اس کے باوجود آخر میں جب ہماری کہانی نگار اس جملہ پر کہانی ختم کرتی ہے ''وہ یہ کہتی ہوئی باہر نکل گئی اور میں رجسٹر اٹھا کر اپنی کلاس کی طرف چل دی۔'' تو کہانی پڑھنے والے کو یوں لگتا ہے جیسے کہانی نگار اور اس کہانی کی ہیروئن دونوں ہی کا مطالبہ اپنے قاری سے یہ ہے کہ ہم نے کہانی سنا دی ہے۔ اس کا اثر لینا تمام تر قاری کی ذمہ داری ہے۔ ہم مزید کچھ نہیں کہنا چاہتے۔ اس کہانی میں کوئی **سسپنس** بھی نہیں ہے لیکن اس کے باوجود آسیہ کی شخصیت کہانی میں خود ایک **سسپنس** کا کام دے رہی ہے۔

اسی طرح دوسرا افسانہ ''ایسا بھی ہوتا ہے'' کہانی کی بنت کے اعتبار سے ایک عمدہ افسانہ ہے۔ اس میں افسانہ کی تکنیک کو بھی ایک حد تک اچھوتے انداز میں استعمال کیا گیا ہے۔ اس مختصر سے افسانہ میں کئی موڑ آتے ہیں لیکن ہر موڑ پر ایک عجیب انداز میں معقولیت اپنا اعجاز دکھاتی ہے۔ میرا مطلب ہے عام طور پر ہمارے افسانہ نگار واقعات کو موڑ دینے کے لئے طرح طرح کے حربے اختیار کرتے ہیں۔ سو سو جتن کرتے ہیں اور پھر بھی بات بنتی نظر نہیں آتی۔ اس کشاکش میں کہانی میں اور جو فضول اور بے کار قسم کے پیچ پڑتے ہیں وہ تو پڑتے ہی ہیں، کہانی سے معقولیت ختم ہو جاتی ہے یعنی کہانی اپنے فطری نیچرل انداز کو چھوڑ کر بھٹکنے لگتی ہے، جس کی وجہ سے قاری کو بہت الجھن ہوتی ہے۔ واقعات کا سلسلہ بے ہنگم ہو جاتا ہے اور کبھی کبھی تو اس طرح کے موڑ قاری کو خاصا پریشان کرتے ہیں لیکن بانو ارشد کے اس افسانہ میں

واقعات کے موڑ اپنی معقولیت اور فطری انداز (نیچرل وے) کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان میں تازگی اور انوکھا پن قائم رہتا ہے۔ مثال کے طور پر "ایسا بھی ہوتا ہے" میں شیتل اور آشا دو ہندو لڑکیاں لندن میں رہتی ہیں--- آسودہ حال گھرانے سے ان کا تعلق ہے۔ چھوٹی بہن شیتل نے قانون پاس کرلیا ہے۔ ایک فرم میں ملازم ہے لیکن اس کی بڑی بہن آشا ایک مسلمان پاکستانی نوجوان نوید سے پیار ہی نہیں کرتی' اس کا بچہ بھی پیٹ میں لئے ہوئے ہے مگر نوید کو اس کے والدین اس کی کزن بنت عم سے شادی کرانے کے لئے پاکستان لے جارہے ہیں اور آشا خاموشی کے ساتھ یہ سب کچھ دیکھ رہی ہے۔ چھوٹی بہن احتجاج کرتی ہے مگر حیرانی کی حد تک اپنے والدین کے سامنے نوید آشا سے واقف ہونے کا بھی انکار کردیتا ہے اور پاکستان سے شادی کرکے لندن اپنے والدین کے ساتھ واپس آجاتا ہے۔ مگر اس نے اپنی بیاہتا بیوی کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔ ایک بار تو بیاہتا بیوی کو ہاتھ نہ لگانا عجیب سا لگتا ہے لیکن افسانہ نگار نے صرف یہی مرحلہ خوبی سے طے نہیں کیا' اس بیاہتا لڑکی کی شادی اس کے دیور ولید سے کرادی اور والدین کو بھی راضی کرلیا ہے کہ وہ نوید سے اسے طلاق دلا کر اپنے چھوٹے بیٹے سے اس کی شادی کردیں اور نوید نے آشا سے شادی کرلی۔ یہ تمام واقعات ہزار انوکھے ہونے کے باوصف اس نیچرل انداز میں موضوع میں آتے ہیں کہ افسانہ اپنی تکنیک کے ضابطوں کو بھی قائم رکھتا ہے اور قاری کے لئے بھی مسرت اور حیرت کا باعث بنتا ہے۔

بانو ارشد کے ان دو افسانوں کے علاوہ دوسرے افسانوں میں بھی بظاہر کوئی انوکھا پن نظر نہیں آتا لیکن ذرا غور سے کام لیا جائے تو پتا چلتا ہے ہماری افسانہ نگار اپنے ہر افسانہ میں اپنی ایک نئی تکنیک سے کام لیتی ہے اور کوئی پیغام بھی ضرور دیتی ہے۔ پیغام دینے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ بانو ارشد کے افسانوں میں مقصدیت نے کوئی گھٹن کی فضا پیدا کردی ہے--- ایسی بات بالکل نہیں۔ ان افسانوں کی مقصدیت میں ادبیت ہر طرح سے موجود ہے اور چونکہ مقصدیت ادبیت کی دلائی اوڑھے ہوئے ہے' اس لئے اس کا حسن برقرار رہتا ہے اور وہ کہیں بھی وعظ نہیں بننے پاتی۔ افسانہ "بھکارن" میں ایک خود رحمی کی شکار لڑکی کا بانو نے اچھا خاصا نفسیاتی تجزیہ کرکے دکھایا ہے۔ اسی طرح ایک نہایت مختصر افسانہ "تم" میں گویا افسانہ نگار نے اپنے "رومانی موڈ" کا خوبصورت تجزیہ کیا ہے۔ مجھے تو یوں لگا جیسے "تم" افسانہ نہیں بلکہ افسانہ کی صورت میں بانو نے ایک غزل کہہ ڈالی ہے۔ دیکھئے نا غزل کسے کہتے ہیں محبوب کی

یا، کو اور ''تم'' میں ہماری افسانہ نگار اپنے محبوب کو یاد کر رہی ہے اور اس طرح یہ افسانہ ایک غزل کی صورت اختیار کر گیا ہے۔

ویسے بانو نے اپنی کتاب کا نام ''بانو کی کہانیاں'' بہت موزوں رکھا ہے جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں بانو جس انداز میں افسانہ لکھتی ہیں، ہم اسے کہانی کہنے کے انداز سے زیادہ قریب پاتے ہیں۔ ان کی تکنیک عام افسانہ کی تکنیک نہیں ہے، جس کی سادہ بیانی کو کہانی سے زیادہ قریب کہا جاسکتا ہے۔ وہ اپنے قاری کو پریشان نہیں کرتیں بلکہ اس کے برعکس مطمئن کرنے کی کوشش ان کے ہاں بہت پائی جاتی ہے اور اس میں وہ کامیاب بھی ہیں۔ ابھی بانو کا یہ سفر جاری ہے اور ان سے آئندہ ہمیں اپنے انداز کی اچھی کہانیاں اور افسانے حاصل کرنے کی بڑی امید ہے۔ ایسی کہانیاں ایسے افسانے جو اپنے پڑھنے والوں کو ایک اطمینان حیات افروز سے مالا مال کر دیں گے۔

رضا علی عابدی

کہانی کی کہانی

کہانی یا افسانے کے معاملے میں میرا اور بانو کا نظریہ یکساں ہے۔ میری رائے سے جدید افسانہ لکھنے والے خوش نہیں ہوں گے مگر میری رائے یہ ہے کہ جسے ہم روایتی کہانی کہتے ہیں اور بعض لوگ ذرا حقارت سے کہتے ہیں پہلے اس کے سارے امکانات نمٹا دیئے جائیں' اس کے بعد جی بھر کے علامتی کہانیاں لکھی جائیں' جدیدیت کے جتنے تجربے ہو سکتے ہیں کر لئے جائیں اور سرریلزم کے ایسے کارنامے دکھائے جائیں کہ اس اصطلاح کا موجد کانوں کو ہاتھ لگا کر کہے کہ میری توبہ۔

ایک واضح مثال غزل کی ہے۔ چار سو سال سے تو ہم جانتے ہیں کہ لکھی جا رہی ہے اور اپنی اسی روش میں ایسی ایسی نئی راہیں نکال رہی ہے کہ نہ اس کے روپ میں کمی آتی ہے نہ اس کے نکھار میں اور پھر یہ کہ جس طرح کہانی ہم نے مغرب سے مستعار لی ہے' غزل بھی ہندوکش کے پار سے آئی ہے۔ جب غزل کی صدیوں پرانی مبادیات برقرار رکھتے ہوئے اسے سو سو طرح سے برتا جا سکتا ہے تو کہانی میں جست بھر کر اسے اٹھا اٹھا کر پٹخنی دینا کیا ضروری ہے۔

بانو کی کہانیوں کی بنیادی خوبی یہی ہے کہ وہ کہانی کو چھیل کر جدیدیت کا گودا نکالنے کی کوشش نہیں کرتیں بلکہ مجسم کہانی کو سنوار کر اندر سے واقعات کا تسلسل نکالتی ہیں جو افسانے کی تمام کلاسیکی تعریفوں پر پورا اترتا ہے۔ ان کی کہانی کے اندر ہی نہیں بلکہ اطراف میں بھی کہانی چل رہی ہوتی ہے۔ ان کا قاری تفہیم کی اسی منزل پر ہوتا ہے کہ وہ خود اظہار کی جس منزل پر ہوتی ہیں۔ اسی طرح راوی اور قاری کے درمیان وہ مکالمہ قائم ہوتا ہے جسے ادھر اردو کے بعض افسانہ نگاروں نے کلیشے قرار دے کر چکنا چور کر دیا تھا۔

بانو جس معاشرے میں رہتی ہیں اور جن روایات کو برتتی ہیں' قلم کی سلائیوں پر ان ہی

کو بنتی ہیں۔ نہ ان کا تجربہ اجنبی ہے' نہ ان کا طریقہ ء اظہار۔ ہماری بات ہمیں کو سناتی ہیں مگر اپنے اسلوب میں۔ کہانی کو یہ روپ کس نے' کب اور کیوں دیا' اس بحث سے قطع نظر اس حقیقت کا اعتراف کرلینا چاہئے کہ جہاں تک اردو کہانی کا تعلق ہے یہی جدید اردو کہانی ہے۔

بانو بہت عرصے سے اپنی سرزمین سے دور ہیں۔ منظر اور ماحول کا یکسر بدل جانا کبھی کبھی تخلیق کار کے حق میں اچھا ہوتا ہے۔ ایک طرح کے شجر پر ایک اور طرح کی قلم لگانے سے اکثر اوقات بہتر پھل پیدا ہوتا ہے۔ بانو کو یہ مقام حاصل ہے کہ وہ کہانی میں تنوع کے امکانات خوب خوب برت لیتی ہیں۔

مجھے ان سے بس یہی ایک شکایت ہے کہ وہ مغرب میں رہ کر خود مغرب کے ادب سے کٹی ہوئی ہیں یا اگر نئے ادب پر ان کی نگاہ ہے تو وہ اپنی تحریر میں اس کا اظہار نہیں ہونے دیتیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ وہ جدید برطانوی یا امریکی کہانی جیسی کہانی لکھیں لیکن کہیں کہیں ایک آدھ جھونکا پورب سے بھی آجائے تو کیا ہے۔ مشرق کے ڈھب کی کہانی مغرب میں لکھی گئی ہے اگر کبھی کبھی اس کا اظہار بھی ہوجائے تو کیا اچھا ہو۔ میں مانتا ہوں کہ بانو خالص برطانوی موضوع پر لکھتی رہتی ہیں لیکن اک ذرا سا اسلوب بھی برطانوی یا مغربی ہو تو اردو فکشن میں یہ ایک گراں قدر اضافہ ہوگا۔

برطانیہ میں اردو افسانے کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس میں خواتین پیش پیش ہیں۔ نام لئے بغیر کہا جاسکتا ہے کہ ان میں سے بعض خواتین نے بین الاقوامی سطح پر مقام بنانا شروع کردیا ہے۔

اس پس منظر میں کہا جاسکتا ہے کہ بانو کے سامنے میدان ہے اور کشادہ میدان

نیر جہاں

تمنا کے سفر کا دوسرا قدم

بانو ارشد کے افسانوں کا یہ مجموعہ تمنا کے سفر میں ان کا دوسرا قدم ہے۔ اتنے مختصر سے عرصے میں دو کتابوں کی تصنیف اس بات کی علامت ہے کہ بانو میں تخلیقی صلاحیتیں بہت زیادہ ہیں۔ عموماً" جب کوئی ادیب یا شاعر بہت زود طبع ہوتا ہے تو فنی اعتبار سے تخلیق کمزور ہو جاتی ہے لیکن بانو کے افسانوں میں کمزوری کہیں نہیں ملتی۔ ان کی کہانیاں ہمیشہ کی طرح ہر اعتبار سے مضبوط ہیں اور حقیقت پر مبنی اور دلچسپ ہیں۔

بانو ارشد کی کہانیوں کا تانا بانا سیدھے سادے واقعات سے بنا ہوا ہوتا ہے۔ ان کے کردار دور پہاڑی گپھاؤں میں زندگی کی حقیقت ڈھونڈنے نہیں جاتے بلکہ اپنے چھوٹے چھوٹے مسائل سے اپنے ماحول کی ناسازگاری کے باوجود بنتے ہیں اور روزانہ عملی زندگی میں پیش آنے والی رکاوٹوں اور عملی مشکلات کا حل تلاش کرتے ہیں یہی ان کا نروان ہے۔

بانو ارشد کی کہانیاں ایک ملک یا ایک علاقے تک محدود نہیں ہیں بلکہ مختلف شہروں اور ملکوں کے پس منظر میں بڑھتی ہیں۔ کہیں لندن ہے' جہاں صومالیہ سے ہجرت کرنے والے خاندانوں کے دکھ ہیں' کہیں پاکستان یا ہندوستان ہے----- مگر سارے دکھ مشترک ہیں کیونکہ سوشل اعتبار سے تقریباً" سارے کردار مڈل کلاس سے تعلق رکھتے ہیں۔ بانو نے جو دیکھا' محسوس کیا' سمجھا اور پرکھا اسے نوک قلم تک لے آئیں' اس لئے ان کی ساری کہانیاں صداقت کے اظہار کا حقیقی عکس ہیں اور سچائی سے بڑی کوئی خوبی نہیں کیونکہ سچ حق ہے۔

بانو ارشد نے اپنے افسانوں میں چند ایک ایسے topics بھی منتخب کئے ہیں' جن پر لکھنا نہ صرف مشکل ہے بلکہ بڑی حد تک ممنوع ہے۔ مغربی معاشرے میں یہ صورتحال اکثر سامنے آتی ہے اور اس کے لئے کسی ہمت یا جرات کی ضرورت نہیں ہوتی لیکن مشرقی تہذیب میں

اس کا تصور محال ہے اور اظہار کے لئے بڑی جرات اور حوصلے کی ضرورت ہے۔ **مثلاً** ''وہ کون تھی'' میں ایک جرنلسٹ کو ایک ایسا مجرم قتل کر دیتا ہے جس کی ماں ایک انٹرویو میں اپنے بیٹے کے کردار کا وہ گھناؤنا رخ پیش کر دیتی ہے جسے وہ ہر قیمت پر پوشیدہ رکھنا چاہتا ہے اور **نتیجتاً** اپنے راز کے افشا ہونے کے خدشے میں وہ جرنلسٹ کو قتل کر دیتا ہے۔

Sexual Perversion اور Incest پر قلم اٹھانا بہت بڑے حوصلے کا کام ہے۔ اسی طرح ''ماش کی دھلی ہوئی دال'' میں دو لڑکیوں کی دوستی کچھ اس انداز سے بیان کی گئی ہے جو مغربی دنیا میں تو آسانی سے Lesbian کے لیبل کے تحت قبول کی جا سکتی ہے۔ اسی طرح ''ایسا بھی ہوتا ہے'' میں محبت' شادی اور طلاق کا مثلث کرداروں کی جنسی بے راہ روی کے تحت ایک گورکھ دھندہ بن جاتا ہے اور مذہب جو غیر ممالک میں بھی ہر فعل کی بنیاد سمجھا جاتا ہے' اس کہانی میں اس کے پرخچے اڑ جاتے ہیں۔

ہرچند کہ بانو ارشد کسی Feminist تحریک سے وابستہ نہیں ہے۔ تاہم ہر افسانے میں جہاں بھی عورت مظلوم ہے وہ سر اٹھا کر یہ ضرور سوال کرتی ہے کہ آخر میرے ساتھ ہی Discrimination کیوں ہے؟ جو ظلم مجھ پر ہو رہا ہے اس سے میرا Counterpart کیوں مستثنیٰ ہے؟

افسانہ ''مٹر پلاؤ'' ایک بہت ہی خوبصورت کہانی ہے' اس میں ایشیائی کلچر کے ان زاویوں کو پیش کیا گیا ہے جو بہت ہی خیال انگیز ہیں۔ اس کہانی میں ایک مشرقی لڑکی' ایک گورے انگریز کو اس حد تک پسند کرنے لگتی ہے' جہاں خیال کے ساتھ محبت کی دستکیں سنائی دینے لگتی ہے۔ اس گورے سے وابستگی کا خیال لڑکی میں احساس جرم پیدا کرتا ہے اور اس کے ذہن میں بار بار یہ سوچ جنم لیتی ہے کہ جب مشرقی مرد کسی مغربی لڑکی سے وابستہ ہوتا ہے تو ہمارا معاشرہ اور کلچر اسے روزمرہ کی زندگی کا ایک عمل قرار دیتے ہوئے کوئی اہمیت نہیں دیتا لیکن اگر مشرقی لڑکی کوئی ایسا قدم اٹھا لے تو ایک Scandalous Situation بن جاتی ہے اور قیامت آجاتی ہے ------ مشرقی کلچر کا یہ دوغلا پن عموماً'' نظر انداز کر دیا جاتا ہے مگر بانو ارشد نے نہایت بھولے پن سے اس کی نشاندہی کی ہے۔

''قاتل کون'' "Self Raproachment" کی ایک خوبصورت مثال ہے۔ یہاں بھی بانو کا طرز تحریر اور اظہار حقیقت جو انہیں دوسرے قلمکاروں سے ممتاز کرتا ہے' وہ ہے ان کا Non Judgemental انداز ------ اپنی کہانیوں میں وہ کوئی فیصلہ خود صادر نہیں فرماتیں

بلکہ کون ولن ہے اور کون فرشتہ' یہ Option قارئین کو دے دیا جاتا ہے۔

بانو ارشد کی کہانیوں کو پڑھتے ہوئے قاری آنکھ بند کرکے یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ ایک خاتون کی تحریر ہے' ورنہ "ماش کی دھلی دال" اور "مٹر پلاؤ" کا پورے چٹخاروں کے ساتھ ذکر بھلا اور کہاں مل سکتا ہے۔

میری دعا ہے کہ خدا بانو ارشد کے قلم کو زور آور بناتے ہوئے ان کی منظر کشی' زبان کی چاشنی' حقیقت بیانی اور سیدھے سچے انداز بیان کی توفیقات میں اور اضافہ کرے (آمین)۔

عمران الارشد

میری چھوٹی سی بہن

خاندانی، فطری اور ذہنی اشتراک کا رشتہ دراصل ہمارا روایتی خزانہ ہے، اس لئے کسی تخلیق کار کا ادبی شعور اس وقت پہچانا جاسکتا ہے جب اس کے شہہ پارے میں معانی کی تلاش کی جائے اس تلاش میں علامتی مناظر پیدا کرنا اور سمجھنا مشکل کام ہے علامتی مناظر دراصل کسی ادیب کی اپنی ذات اور روایات کا عکس ہوتے ہیں، اس میں نہ صرف گھریلو زندگی شامل ہوتی ہے بلکہ سیاسی ماحول، سفر، مذہب، عشق، محبت، تعلیم سبھی کچھ اس کے اسلوب اور انداز فکر میں سمایا ہوتا ہے، اس لئے جب تک ہم قلم کار کے اس پس منظر سے واقف نہ ہوجائیں کسی شہہ پارے یا تخلیق پر انصاف سے کوئی رائے قائم نہیں کرسکتے اور یہ بات قاری کے لئے بھی کہی جاسکتی ہے۔

میرے والد مرحوم مولانا ارشد تھانوی کی بارہ اولادیں تھیں جن میں تین بہنیں اور چار بھائی حیات ہیں جبکہ دو بھائی جوانی ہی میں انتقال کرگئے اور تین بہنیں بچپن ہی میں اللہ کو پیاری ہوگئیں۔ میں اپنے والد کا تیسرا بیٹا ہوں۔ چوتھی عذرا ہیں اور بانو ارشد نویں نمبر پر ہیں۔

ہم تین بڑے بھائی سلمان الارشد (بھائی جان مرحوم) سلطان الارشد (بھائی صاحب مرحوم) اور میں عمران الارشد ابھی چھوٹے ہی تھے کہ ہمیں عذرا جیسی بہن مل گئی اور ہم تینوں بھائیوں نے اس بہن کو بہت چاہا۔

میرے والد اپنے زمانے کے بڑے مشہور ادیب اور شاعر تھے۔ وہ 1912ء سے لکھ رہے تھے۔ 1919ء تک ان کی چھ کتابیں شائع ہوچکی تھیں۔ ایک انگریزی ناول "Around

"the world" کا اردو ترجمہ "طواف زمین" کے نام سے شائع ہو چکا تھا۔ ایک نظموں کا مجموعہ "نوائے تلخ" شائع نہ ہو سکا۔ اس کا قلمی نسخہ برٹش لائبریری میں محفوظ ہے۔

میری والدہ "خاتون ارشد" کے نام سے لکھتی تھیں۔ وہ تہذیب نسواں (لاہور) عصمت (دہلی) اور حریم (لکھنؤ) میں بحیثیت مضمون نگار اور شاعرہ شائع ہوتی تھیں۔ اس کے بعد انہوں نے بھوپال سے خواتین کا رسالہ ماہنامہ "بانو" نکالا جو غالباً" چھ یا سات سال تک مستقل نکلتا رہا۔

میرے والد محترم نے میرے پھوپھی زاد بھائی محمد احمد سبزواری کو بچپن ہی سے ادب کی جانب راغب کر رکھا تھا۔ وہ اپنے ماموں ارشد تھانوی کو "ابا دوست" اور میری والدہ کو "امی دوست" کہتے۔ وہ یو این او میں معاشیات کے شعبے سے منسلک رہے اور آجکل روزنامہ "جنگ" کے معاشیات کے کالم نگار ہیں' ان پر بھی کئی مشاہیر کے مضامین شائع ہو چکے ہیں۔

میرے بڑے بھائی سلمان الارشد نے بھی بہت کم عمری سے لکھنا شروع کر دیا تھا۔ وہ اپنے دور میں ادیب انقلاب کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان کی دو ناولیں آزادی سے قبل شائع ہو چکی تھیں۔ وہ انجمن ترقی پسند مصنّفین کے جنرل سیکریٹری اور کئی رسالوں کے مدیر بھی رہ چکے ہیں۔ ریڈیو پاکستان سے ان کے ڈرامے نشر ہوتے رہے۔ ان کی بیگم رخشندہ سلمان بھی ڈرامہ نگار تھیں۔ ان کے ڈرامے بھی ریڈیو پاکستان سے نشر ہوتے رہے اور ان کا ایک ناول بھی شائع ہو چکا ہے۔ ان کی بڑی بیٹی نوشابہ سلمان بھی ایک ناول کی مصنف ہے۔

سلطان الارشد مرحوم بھی مزاحیہ اور طنزیہ افسانہ نگار تھے وہ لکھنؤ کے ماہ نامہ "مضراب" کے معاون مدیر رہے۔

خاکسار عمران الارشد نے بچپن میں بچوں کی کہانیاں لکھیں اور اس کے بعد افسانے لکھے۔ تقریباً" ساٹھ افسانے لکھے میں نے "گہوارہ ادب (بھوپال) ہفتہ وار آئینہ (بمبئی) اور ماہنامہ مشہور دہلی" کی بھی ادارت کی ہے۔

میرے افسانوں کا مجموعہ "ایک شگاف" کے نام سے 1956ء میں کراچی سے شائع ہوا تھا۔ انجمن ترقی پسند مصنّفین کا پروپیگنڈا سیکریٹری رہ چکا ہوں۔ عذرا عادل رشید شاعرہ بھی ہیں انہوں نے کچھ عرصہ بمبئی سے ماہنامہ "حجاب" شائع کیا۔ آجکل وہ امریکہ میں مقیم ہیں۔

ان کے شوہر عادل رشید مرحوم تقریباً" دو سو ناولوں کے مصنف تھے اور ان کی کئی کتابوں کے مراٹھی اور ہندی میں ترجمہ ہو چکے ہیں۔ آپ بمبئی سے ایک رسالہ "شاہد" ویکلی تقریباً" 25 سال تک نکالتے رہے۔

مہربانو جو سب سے چھوٹی بہن ہیں کراچی میں رہتی ہیں اور شعر و شاعری کرتی ہیں۔ خاموش پسند ہیں۔ اب بات آتی ہے بانو ارشد (شہربانو) کی--- اس گھریلو ماحول کا اثر ہم سب بھائیوں اور بہنوں پر ہے۔ ہم خوش قسمت ہیں کہ ہمارے گھر میں ہمیشہ ادبی فضا رہی۔ نواب بھوپال کی سالگرہ پر آل انڈیا مشاعرے بھوپال میں منعقد ہوتے تھے اور اس دور میں بھوپال سے آئے ہوئے شعراء جیسے جگر مراد آبادی' ساغر نظامی' شوکت تھانوی' احسان دانش' حکیم آزاد انصاری اور مقامی شعراء اور ادیب جیسے کوثر چاند پوری' شعری بھوپالی وغیرہ ہمارے گھر آتے تھے۔

جگر مراد آبادی کا کھانا پینا ہمارے ہی گھر میں تھا۔ میری والدہ نے ان کے لئے برتن الگ کردیئے تھے کیونکہ وہ اس زمانے میں شراب کے عادی تھے۔ گھر میں چھوٹے بچوں کا باہر جانا مناسب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ ہم لوگوں کا کام صرف کھانا اور دوسرے لوازمات یعنی چائے' مٹھائی اور پان وغیرہ پہنچانا ہوتا۔ بانو کو صرف اجازت تھی بانو میرے والد کی بہت چہیتی بیٹی تھی اس لئے اسے اس محفل میں جانے کی اجازت تھی۔ وہ اکثر جگر صاحب کی گود میں جا بیٹھتی وہ بھی اس کو بہت چاہتے تھے۔

ہمارے گھر میں رسالے اور کتابیں بہت آتی تھیں۔ بچوں کے رسالے "کھلونا' پھول' بچوں کی دنیا' اور پریم" آتے جن میں سب سے پہلے میں نے کہانیاں لکھنا شروع کیں۔ اس کے بعد بانو نے ان رسالوں میں کہانیاں لکھیں۔

بانو بھوپال کے گرلز اسکول میں زیر تعلیم تھی' جہاں کئی لڑکیاں اس کی دوست تھیں ان میں ایک لڑکی سے بانو کی گہری دوستی ہوگئی' اس کا نام نیر جہاں تھا جو آجکل لاس اینجلس میں " اردو مرکز" کی سربراہ ہیں یہ دوستی آج تک قائم ہے۔ بانو نے جب ابتداء میں کہانیاں لکھنا شروع کیں تو ہم نے اس کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا بلکہ اس کو یہ کہہ کر چھیڑتے رہے۔

ایک لڑکی بگھارتی ہے دال

دال کرتی ہے عرض یوں احوال
شرم تم کو مگر نہیں آتی

آزادی کے بعد ہم لوگ پاکستان آ گئے۔ بانو نے اسکول میں داخلہ لیا۔ پھر کالج اور یونیورسٹی۔ یہ عمر کا وہ حصہ تھا جب لڑکے اور لڑکیوں کو شاعری اور افسانہ نگاری سے دلچسپی ہو جاتی ہے۔ ان کے محبوب شاعر ہوتے ہیں۔ بانو کی سعی اور جستجو بڑھتی گئی۔ بانو کو ہزاروں اشعار زبانی یاد تھے' وہ یونیورسٹی کے بیت بازی مقابلوں میں حصہ لیتی اور انعامات حاصل کرتی۔ بانو کی شعری اور ادبی صلاحیتوں کو خاندان اور احباب کی طرف سے بڑا سہارا ملا۔ اب اس کی دوستوں میں حسینہ معین (ڈراما نگار)' سعیدہ عروج اور نیر جہاں شامل تھے۔

بانو کے ادبی کارناموں کا احساس مجھے اس وقت ہوا' جب مری نظر اس کے ایک افسانے پر پڑی نام تھا پس پردہ یا پس چہرہ۔ میں نے اس کو پڑھا مجھے تعجب بھی ہوا اور پسند بھی آیا۔ بانو سے میں نے کہا "مجھے اپنی تصویر کے ساتھ یہ افسانہ دے دو۔ میں ماہنامہ "مشرب" (کراچی) کے مدیر اختر انصاری اکبر آبادی کو شائع کرنے کو دے دوں گا۔ بانو کو پس و پیش ہوا مگر میرے زور دینے پر اس نے دے دیا۔ پھر اس کی اشاعت "مشرب" اگست 1953ء کے شمارے میں ہوئی۔ ادبی حلقوں میں وہ افسانہ بہت پسند کیا گیا۔

آزادی کے بعد ہماری سوچیں بدلنا شروع ہوئیں جو لوگ اپنے نظریاتی وطن آئے وہ ابتداء میں کبھی مہاجر نہیں کہلائے۔ آزادی کے خمار میں اپنے وطن کے لئے قربانیاں دینے کا ایسا جوش و خروش تھا کہ ہر قدم پر پاکستان کے لئے سب کچھ دے دینے کو تیار تھے۔ اس جذبہ کو ہر حکومت نے آہستہ آہستہ مٹانے کی کوشش کی۔ لفظ "مہاجر" صرف اردو بولنے والوں کے لئے استعمال ہونے لگا حالانکہ کچھ لوگ مشرقی پاکستان گئے' کچھ مغربی پاکستان آ گئے' جن میں بنگالی' بہاری' یوپی' حیدر آبادی' پنجابی سب ہی شامل تھے۔ ہم بھی اپنی زمینیں اور اپنے مکان لٹا کر آئے تھے۔ میں حکومت کی اسی روش سے بدظن ہو کر لندن آ گیا۔ لندن میں جب سکون مل گیا تو میں نے بانو کو بھی بلا لیا۔ بانو کو اب تیسرا ماحول ملا۔ بانو نے یہاں آ کر بہت افسانے لکھے' شاعری کی' ادبی محفلوں کی نظامت کی' کتابوں کی رونمائی پر مضامین پڑھے جن کو برطانیہ کے علاوہ پاک و ہند میں بھی سراہا گیا۔ اس طرح بانو کا حوصلہ اور بڑھا اور اس نے ادبی

محفلوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا شروع کیا۔ ادبی تخلیقات میں اس کی رفتار اور تیز ہو گئی۔ بانو نے دنیا کے کئی ممالک کا سفر کیا ہے۔ اسے نئے تجربات حاصل ہوئے۔ اس کے نقطہ نظر میں تبدیلیاں بھی آئیں فکر و نظر کا یہ تغیر اس کی کہانیوں میں بھی نظر آتا ہے۔ یہ بانو کی دوسری کتاب ہے اور مجھے اس کا بڑے بھائی ہونے کے ناتے خوشی بھی ہے اور فخر بھی کہ بانو نے اپنے ورثہ کو حفاظت سے رکھا ہے۔ میں اس کو اس کی بہترین کاوش پر مبارکباد پیش کرتا ہوں ۔

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

تم

تم کون ہو کہاں ہو؟ تمہاری آواز اتنی خوب صورت ہے دور سے آ رہی ہے، مجھے بلا رہی ہے "آؤ آؤ" یہ کس کی آواز ہے؟ اس قدر رسیلی جو میرے دل سے بھی پرے افق کے اس پار گم ہو جاتی ہے اور میں فضا میں اڑتے اڑتے ایک دم ریتیلے ساحل پر آگرتا ہوں اور وہ آواز دھیمی دھیمی میرے کانوں میں گونجتی رہتی ہے لیکن آس پاس دور دور کوئی نہیں ہے۔ تم پھر مجھے ایک کشتی میں نظر آتی ہو، جس میں ہم دونوں بیٹھے ہیں اور میرے ہاتھ میں چپو ہیں اور میں چلا رہا ہوں۔ تمہارے گلے میں موتیا کے ہار پڑے ہیں اور تم بانسری بجا رہی ہو، جس کی دھن اور لے کہہ رہی ہے آؤ آؤ اور جیسے ہی میں تم کو چھونا چاہتا ہوں، تم غائب ہو جاتی ہو پھر تم مجھے چاند میں بیٹھی نظر آتی ہو اور وہاں سے مجھے ہنس ہنس کر بلا رہی ہو۔ سارے میں چاندنی پھیلی ہوئی ہے۔ اس پیلی پیلی اور ٹھنڈی چاندنی میں تم نے بسنتی رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے ہیں اور سر میں پیلے رنگ کا گجرا اپنے جوڑے میں گوندھا ہوا ہے۔ کس قدر خوب صورت نظر آ رہی ہو اور شریر آنکھیں مجھے اپنی طرف دعوت دے رہی ہیں اور چند لمحے کے بعد وہاں کچھ نہیں ہے پھر وہی تخیل ایک مانوس سی شکل میں مجھے اپنی کافی کی پیالی میں نظر آنے لگتا ہے۔ یہ کافرانہ ادائیں شوخی کرتی ہوئی، ان گرم گرم لہروں میں رقص کرنے لگتی ہیں اور میں جب ہونٹوں سے پیالی لگاتا ہوں تو تم مجھ سے اس طرح گریزاں ہوتی ہو جیسے ساحل سے لہریں اور تمہاری شکل کافی کی پیالی میں بھنور میں ڈوب جاتی ہے۔ تم کیوں مجھ سے کھیل رہی ہو میرے جذبات سے مذاق کر رہی ہو۔ پھر میرے ساتھ بیٹھی شطرنج کھیل رہی ہو۔ میں تم کو بہت ہی پیار سے دیکھ کر اپنے دل میں بسانے کی کوشش میں ہوں اور تم اچانک مجھے مات دے کر ایک **قہقہہ** لگاتی ہوئی فضا میں بکھر جاتی ہو۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ تم صرف میرا تخیل ہو یا واقعی اصلیت میں موجود ہو کیوں میرا سائے کی طرح پیچھا کر رہی ہو۔ میری نظر کا دھوکا ہو۔ اچانک میرے ساتھ آکر بیڈمنٹن کھیلنا شروع کر دیتی ہو۔ پھر ایک زور کا شاٹ مار کر **قہقہہ** لگاتی ہو اور شٹل

کاک بن کر ہواؤں میں پرواز کرجاتی ہو..... ایک دم جاکر جھولے میں بیٹھ جاتی ہو اور میں تم کو جھولا دے رہا ہوں۔ وہ جھولا پھراوپر جاتا ہے اور جب واپس آتا ہے تو وہ خالی ہوتا ہے اور ایک آواز آتی آؤ- آؤ پھر بادلوں سے جھانکتی نظر آتی ہو' جگنو کی سواری شروع کردیتی ہو اور میں ایک وحشت زدہ پاگل انسان تمہارے پیچھے دوڑ رہا ہوں' تم نے اپنی محبت میں سرشار کردیا ہے۔ تمہاری ہنستی ہوئی شوخ آنکھیں لمبے لمبے بال صندلی چہرہ یہ سب کیا ہے۔ میرے برابر میں گاڑی میں بیٹھ جاتی ہو' میں ایک لمبی سیدھی سپاٹ سڑک پر گاڑی چلا رہا ہوں اور تم میرے برابر میں بیٹھی ایک گیت گا رہی ہو' کبھی کبھی بہت پیار سے میرے کندھے پر اپنا سر ٹکا دیتی ہو اور میں اسٹیئرنگ چھوڑ کر تمہارے سر پر ہاتھ رکھتا ہوں' وہاں کوئی نہیں ہوتا برابر کی خالی سیٹ مجھ کو منہ چڑا رہی ہوتی ہے۔ خدارا مجھے اس طرح تنگ نہ کرو۔ وہ دیکھو' تم ہوائی جہاز کی سیڑھیوں پر چڑھ رہی ہو اور مجھے آواز دے رہی ہو' مڑ مڑ کر لیکن میں جب سیڑھی پر پیر رکھتا ہوں' سیڑھیاں مجھے ٹھوکر مار کر اوپر اٹھ جاتی ہیں اور جہاز کا دروازہ بند ہوجاتا ہے اور میں زمین پر آگرتا ہوں' تمہارا جہاز بلندی کی طرف دھیرے دھیرے پرواز کرتا ہے' کھڑکی میں سے ایک دھندلا دھندلا ہاتھ الوداع کا اشارہ کرتا ہے اور پھر وہ جہاز فضا میں کھو جاتا ہے۔

میں آئینے میں اپنا سر جھاڑ اترا ہوا چہرہ دیکھ رہا ہوتا ہوں اور شیو کرنے کے لئے برش کو اپنے گالوں کے نچلے حصہ پر لگاتا ہوں' پیچھے سے ایک خوبصورت ہاتھ وہ برش لے لیتا ہے آؤ آؤ اور تم اسے رکھ کر میری آنکھیں بند کرلیتی ہو جیسے ہی میں ان کو پکڑنا چاہتا ہوں تو وہاں کوئی نہیں کوئی نہیں میرے اپنے ہی ہاتھ میری آنکھوں پر مٹھیاں بند ہوتے نظر آتے ہیں۔ خدارا تم کون ہو کیا ہو؟ مجھے ایسے تنگ نہ کرو' میں تمہاری آواز اور تمہارے تصور کے پیچھے بھاگ رہا ہوں اور پھر تم مجھے ریل کی کھڑکی میں بیٹھی نظر آتی ہو۔ کیا قیامت ہو غضب ڈھا رہی ہو' وہ ہی آشنا تبسم اور جب میں تمہاری طرف بڑھتا ہوں تو ریل دھیرے دھیرے رینگنا شروع کردیتی ہے اور پھر میری رفتار جب تیز ہوتی ہے تو ریل تیز ہوجاتی ہے اور تمہاری انگلیاں ماتھے کی طرف اٹھتی اور سلام اور الوداع دونوں کا پیغام دیتی ہوئی اور تمہارے چہرہ کو چھپاتی ہوئی میری نظروں سے اوجھل ہوجاتی ہیں۔ میں مایوس اور لاچار واپس پلٹتا ہوں۔ سامنے سے تم کتابیں ہاتھ میں تھامے میرے برابر سے مسکراتی ہوئی گزر جاتی ہو۔ تم میری روح ہو' میرے ذہن پر چھاتی چلی جارہی ہو۔ میں تمہاری تلاش میں ہوں' تمہاری آنکھوں میں دریائے نیل کی گہرائی' تمہارا چندن سا بدن' تمہارا چمپئی رنگ بھینی بھینی خوش بو جو تم ابھی

بکھراتی ہوئی گزر گئیں۔ میں ایسا سرشار مست ہوا جارہا ہوں۔ تمہاری ناچتی ہوئی آنکھیں' ایک پھول سا چہرہ ہر وقت میری آنکھوں میں بسا رہتا ہے' اسے کہاں تلاش کروں۔ میرا جی چاہتا ہے تم سراپا حقیقت بن کر میرے پاس آجاؤ اور میری پریشانی سے وہ پسینے کے قطرے پونچھ ڈالو جو تھکن سے نمایاں ہیں۔ میرا سر دباؤ اور میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لو۔ مجھے سہارا دو۔ میں بہت تھک گیا ہوں' تمہاری تلاش کرتے کرتے تم ہر بار ایک جھلک دکھا کر کیوں چھپ جاتی ہو؟ تم میرا خواب و خیال ہو۔ تم میری تعبیر ہو مجھ سے روٹھ کر نہ جاؤ۔ اس روشنیوں کے شہر میں جو بھیڑ بھاڑ ہے' میں تنہا ہوں' مجھے صرف آواز سے نہ بہلاؤ۔ تم آجاؤ میرے پاس اور میرے اس عارضی لمحہ کو اس وقتی تصور کو جاودانی بخش دو خدارا تم آجاؤ نا.....
اب نہ تڑپاؤ.....

تم تو خود ایک کہانی ہو

فائزہ حسب معمول لنچ ٹائم میں اپنا لنچ باکس اور کافی کا مگ لے کر اسٹاف روم کے اپنے پسندیدہ کونے میں پڑی کرسی پر جا بیٹھی۔ وہ اپنا سینڈوچ کھا رہی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ جولیا جو اسٹاف روم کے دروازے کے قریب ہی بیٹھی اخبار کی ورق گردانی کر رہی تھی، اٹھی، دروازہ کھولا، کسی سے بات کر کے واپس آ کر بولی "فائزہ شریفہ تم کو بلا رہی ہے"

فائزہ اپنا کافی کا مگ اور لنچ باکس میز پر رکھ کر باہر آئی۔ شریفہ نے بے حد ادب سے اسے سلام کیا "مس آپ اگر مصروف نہ ہوں تو آپ سے کچھ بات کروں، میں نے آپ کو ڈسٹرب تو نہیں کیا؟"

"ہاں کہو کیا بات ہے"

"آپ سے یہ کہنا ہے کہ آپ مجھے ایک چیز سکھا دیں۔"

"کیا ابھی...... نہیں!"

"آج مسٹر گرین انگلش کی کلاس میں بتا رہے تھے کہ آپ کہانیاں لکھتی ہیں اور وہ شائع بھی ہوتی ہیں۔"

"ہاں شریفہ"

"پھر مس آپ مجھے بھی سکھا دیجئے، سکھا دیں گی؟"

"تم کو شوق ہے؟"

"میں ایک ادیبہ بننا چاہتی ہوں۔"

"شریفہ تم سے پھر بات کروں گی۔"

"مس آپ وعدہ کیجئے کہ آپ مجھے یہ کام سکھا دیں گی میرے پاس بہت سی کہانیاں ہیں۔"

"کیا مطلب" فائزہ نے پوچھا۔

"یعنی میرے ذہن میں ہیں۔ میں ان کو لکھنا چاہتی ہوں۔"

اتنی چھوٹی سی لڑکی سے یہ بات سن کر فائزہ حیران ہو گئی۔ ”چلو میں تم سے فرصت نکال کر بات کروں گی۔“

”مس آپ صرف ہاں کہہ دیجئے پھر میں جاؤں گی سکھائیں گی نا؟“

اس کی آنکھوں میں ایک معصوم سی التجا‘ بڑی بڑی خوبصورت آنکھیں‘ لمبی لمبی پلکیں‘ اس میں فائزہ کو ہزاروں کہانیاں جنم لیتی دکھائی دیں اور فائزہ کے منہ سے بے ساختہ ہاں نکل گیا۔

”تھینک یو مس“

اور اس کے چہرے پر ایک تشکرانہ مسکراہٹ پھیل گئی جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آجائے۔ فائزہ بھی اسٹاف روم کی طرف مڑگئی سامنے سے اسے ڈیوڈ گرین نظر آئے۔ ”ڈیوڈ آج تم نے اپنی کلاس میں کیا کہہ دیا۔ شریفہ ابھی میرے پاس آئی تھی۔“

”بھئی میں نے بتایا کہ مس خان عید کے لئے ڈرامہ لکھ رہی ہیں جو اسمبلی میں مسز ہل اگلے ہفتہ پیش کریں گی۔ تم نے لکھ لیا.....؟“ ڈیوڈ نے پوچھا۔

”ارے وہ تو میں نے مسز ہل کو پرسوں دے بھی دیا ہے“

”اور ہاں میں نے ان کو بتایا کہ مس خان بہت اچھی کہانیاں لکھتی ہیں اور انگریزی میں ترجمے بھی ہوئے کیا برا کیا؟“

”نہیں یہ بات نہیں کچھ نہیں“

فائزہ نے آکر اپنا کافی کا مگ اٹھایا اور کافی بنا کر پھر آکر بیٹھی اس کو شریفہ کا خوبصورت تبسم یاد آگیا۔ وہ معصوم سی لڑکی کھلتا ہوا رنگ لمبی لمبی دو چوٹیاں اس کے پیچھے پڑی ہوئی۔ روزانہ صاف ستھرے کپڑے پہنے یہ لڑکی اسکول آتی۔ اس کی چال میں ایک وقار تھا‘ چہرہ پر ایک گہری فکر ہر وقت نمایاں بے حد مہذب لڑکی تھی۔ اس کی سنجیدگی میں بھی ایک تفکر نمایاں رہتا۔

فائزہ دوسرے دن اپنے فری پیریڈ میں اس کی کلاس میں گئی اور کہا کہ ”تم میرے ساتھ چلو‘ میں تم کو تمہارے سوال کا جواب دینا چاہتی ہوں“ اور وہ اس کے انگریزی کے استاد مسٹر گرین سے اجازت لے کر اسے اپنے برابر کی کلاس میں جو خالی تھی‘ وہاں لے گئی۔ اس نے نیلے رنگ کے ربن اپنی چوٹیوں میں باندھے ہوئے تھے۔ وہ اسکول کے یونیفارم میں سفید قمیض سرخ دھاری دار ٹائی اور کالے رنگ کی اسکرٹ میں بالکل چینی کی گڑیا لگ رہی تھی۔ اس کے سرمئی رنگ کے موزے‘ کالے پالش کئے ہوئے جوتے بس وہ خود ہی ایک کہانی کا

کردار لگ رہی تھی۔ ’’فائزہ ہاں بھئی کیا بات تھی۔‘‘

’’جی جی میں کہانیاں لکھنا چاہتی ہوں۔ آپ مجھے سکھا دیجئے۔ انگلش کی کلاس میں یہ اتنی چھوٹی کتابیں پڑھتی ہوں تو سوچتی ہوں کہ جین ایر جیسی کتاب میں بھی لکھوں۔ جین آسٹن شارلٹ برانٹی یا ورجنیا وولف بھی تو میری طرح کی لڑکیاں تھیں کبھی۔‘‘

’’ہاں شریفہ پہلے یہ بتاؤ کہ تم کو کیسی کہانیاں اچھی لگتی ہیں۔ فکشن سائنس کی رومانوی یا جاسوسی پہلے تو یہ کہ تمہارا میلان طبع کس طرف ہے۔ کچھ لوگ مزاحیہ کہانیاں لکھتے ہیں، کچھ پریوں کی، اچھا سنو غور سے کہ لکھنے کے لئے پڑھنا بہت ضروری ہے۔‘‘

’’مس میں تو بہت پڑھتی ہوں۔‘‘

’’بہت اچھی بات ہے۔ پھر مشاہدہ جانتی ہو اطراف و گرد و نواح کی چیزوں پر گہری نظر۔ پھر غور و فکر اگر تم حساس ہو۔ قدرت کے نظارے، فطرت کی تخلیقات، یہ سب اپنی طرف مخاطب کریں گی۔ بس ان کو الفاظ میں قید کرنا آجائے گا جیسے مصور رنگوں سے کاغذ پر اپنے تصورات کو پھیلا دیتا ہے۔ اسی طرح تم بھی ایک دن الفاظ کے موتیوں سے کاغذ پر خوبصورت کشیدہ کاری کر دوگی۔‘‘ شریفہ بڑے غور سے فائزہ کی ایک ایک بات سن رہی تھی اور اس کی متوجہ آنکھوں میں چمک تیز ہو رہی تھی۔ ’’چلو ایک کہانی سنو اور تم اس کو لکھو۔ ایک معصوم سی لڑکی تھی، اس کا نام شائستہ تھا۔ وہ بہت اچھی لڑکی تھی۔ اپنے ماں باپ کا کہنا مانتی تھی۔ تمیز سے رہتی تھی۔ بال سلیقے سے سنوارتی تھی۔ اسے کہانیاں لکھنے کا شوق تھا۔ ہر بات بہت غور سے سنتی تھی۔ اپنا ہوم ورک وقت پر کرتی تھی۔ تمام استاد اس کو پسند کرتے تھے۔‘‘

’’یہ تو آپ میری باتیں کر رہی ہیں۔‘‘ شریفہ نے شرماتے ہوئے کہا۔

’’اچھا آگے سنو پھر کیا ہوا۔‘‘ فائزہ نے اس کو روکتے ہوئے اپنی کہانی جاری رکھی۔ ’’وہ لڑکی ایک روز صبح اپنی ایک دوست کے ساتھ اسکول جا رہی تھی، راستہ میں اس نے سڑک پر ایک بلی کا بچہ جو تھا سفید لیکن اس کے چھوٹے چھوٹے کالے دھبے سے اس کے بدن پر تھے۔ وہ مشکل سے دو تین ماہ کا ہوگا۔ بیچ سڑک پر بیٹھا تھا۔ وہ سڑک ایک چوڑی اور مصروف شاہراہ تھی۔ شائستہ اور سنگیتا دونوں فٹ پاتھ پر جاتے جاتے رک گئیں اور انہوں نے ادھر ادھر دیکھا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کو کیسے بچائیں اور دونوں طرف سے کاریں آ جا رہی تھیں۔ شائستہ ایک بہت نرم دل لڑکی تھی۔ اس کو اسکول جانے کو بھی دیر ہو رہی تھی لیکن اس بلی کے ننھے منے بچے کی جان کی بھی فکر تھی۔ ’’ارے وہ دیکھو، سامنے سے وہ مس آ رہی

ہیں۔" سنگیتا نے کہا جو دوسری فٹ پاتھ پر اسکول کے لئے تیز تیز چل رہی تھی۔

"ارے مس بلی کو بچایئے" شائستہ نے چیخ کر کہا۔ مس نے مڑکر دیکھا اور فوراً" سڑک پر سے بلی کے بچہ کو اٹھانا چاہا۔ بلی کا بچہ تو بھاگ کر فٹ پاتھ پر چلا گیا لیکن مس کو کار سے دھکا لگا اور وہ گر گئیں۔ سب گاڑیاں رک گئیں۔ ایک ڈرائیور ان کو فوراً" ہسپتال لے گیا۔

"پھر کیا ہوا مس؟" شریفہ نے بے چین ہو کر پوچھا۔

"ان کو Casuality میں لے جایا گیا' وہاں ان کو فوراً" طبی امداد دے دی گئی۔ بس شاک ہوا تھا ایک گھنٹہ بعد مس اسکول آگئیں۔"

"وہ کس کی بلی تھی؟"

"وہ سنگیتا کی بلی تھی۔ دوسرے دن سنگیتا اور شائستہ اپنی مس کے لئے پھولوں کا گلدستہ اور کارڈ لے کر آئیں کہانی کیسی لگی۔" فائزہ نے جب شریفہ کو دیکھا تو شریفہ رو رہی تھی۔" ارے تم رو رہی ہو؟"

"اب آپ میری کہانی سنیئے میرے ابو ایک دن منے کو لے کر اسکول جا رہے تھے۔ منا آگے آگے بھاگنے لگا اور اس نے فوراً" سڑک کراس کرلی۔ ابو اس کے پیچھے بھاگے کہ یہ کہیں کچل نہ جائے منا تو دوڑ کر فٹ پاتھ پر آگیا اور مڑکر قہقہہ لگایا لیکن ابو کو ایک گاڑی نے مار دیا' ایمبولینس آگئی مگر میرے ابو نے تو راستہ ہی میں دم توڑ دیا اور میری امی' منا اور میں اب اکیلے رہتے ہیں۔ میرے ابو کو کسی نے نہیں بچایا' ڈاکٹر بھی نہ بچا سکے۔ مس میری اپنی کہانی تو....."

فائزہ نے شریفہ کو لپٹا لیا۔ "شریفہ مجھے کیا معلوم تھا' مجھے کیا معلوم تھا تمہاری آنکھوں کی یہ نمی' مجھے کیا معلوم تھا۔" فائزہ بھی شریفہ کے ساتھ پھوٹ پڑی۔ "تم تو خود ایک کہانی ہو....

سفید دھلی ماش کی دال

بس جس روز گھر میں سفید دھلی ماش کی دال پکتی گھر میں ایک ہنگامہ برپا ہو جاتا تھا ننھی کو نہ جانے کیوں اس دال سے اس قدر چڑ تھی گویہ ایک ہی دال ہے، جس کو شاہانہ دال کہا جاتا ہے اور دعوتوں میں دسترخوان کی زینت بنتی ہے گھر میں ابا سے لے کر بچہ بچہ اسے مزے لے کر کھاتا تھا نہیں کھاتی تھی تو صرف ننھی۔

ہوا یوں کہ ایک دن ننھی جب اسکول سے گھر پہنچی تو اس نے اماں سے حسب معمول پوچھا کیا پکایا ہے۔ اماں نے کہا تمہارے ابا کی فرمائش پر سفید ماش کی دال پکائی ہے۔ بس یہ سننا تھا کہ غضب ہو گیا، کہنے کو تو لڑکی صرف آٹھ سال کی تھی مگر گھر میں ہر فرد کی لاڈلی اماں جس دن یہ دال پکاتیں، اس کو کٹوری والا انڈا بنا دیا کرتیں، وہ گول گول دونوں طرف سے سرخ سرخ سکا ہوا بس مزا آجاتا اور ننھی چپ چاپ بیٹھ کر کھالیتی عام طور پر جب یہ دال بنتی تو ننھی کا جواب ہوا کرتا "مجھے بھوک نہیں ہے" اور اماں سمجھ جاتیں کہ اسے کٹوری والا انڈا چاہئے لیکن اتفاق سے گھر میں انڈے بھی نہیں۔ اماں چپ ہو گئیں اور سوچنے لگیں کہ اپنی لاڈو کو کیا بنا کر دیں۔ دوسری طرف تخت کے کونے پر ثریا آپا بیٹھی تھیں بولیں "اماں پریشان نہ ہوں ننھی کو آج بھوک نہیں ہے۔؟" یہ ثریا آپا اماں کی بھتیجی تھیں جو ان کی بھابھی کے مرنے کے بعد سے اماں کے پاس رہنے لگی تھیں۔ ثریا آپا بھی ننھی کو بہت پیار کرتی تھیں بلکہ روزانہ صبح وہی تو اس کو تیار کر کے اسکول بھیجا کرتیں۔ انہوں نے اس کے لئے رنگ برنگی خوبصورت فراکیں سی رکھی تھیں اور اپنے ہاتھ سے گھنڈی والے بٹن کے کالے جوتے پالش کر کے اس کو پہناتیں اور اپنے ہاتھ سے ننھی کی ٹھوری پکڑ کر کنگھی کرتیں اور آڑی مانگ نکال کر دونوں طرف کلپ لگاتیں اور اس کے سر میں ابا کے لگائے ہوئے گلاب کے درختوں سے کبھی لال، کبھی سرخ اور کبھی گلابی پھول توڑ کر ایک طرف لگاتیں اور پھر پیشانی پر پیار کر کے کہتیں، میری ننھی تو بالکل سوتی جاگتی گڑیا کی طرح ہے لیکن آج ثریا آپا کا یہ شرارت

بھرا جملہ ننھی برداشت نہ کر سکی۔ آپا کی بات سن کر وہ مچل گئی۔

"نہیں مجھے بھوک تو لگ رہی ہے' آپ نے ماش کی دال کیوں پکائی جب کٹوری والا انڈا نہیں بنا سکتی تھیں؟" یہ کہہ کر جب وہ غصہ سے تخت پر لیٹی تو دو بھڑیں جو وہاں بیٹھی آپس میں گڈمڈ ہو رہی تھیں' انہوں نے ننھی کے بازو پر ڈنک مار دیئے۔ ننھی بلک اٹھی اماں اور آپا دوڑ پڑیں بازو سوج گیا' اس نازک اور نرم بازو پر چونا اور مرہم لگایا..... بھیا کو بازار سے بھیج کر انڈا منگایا گیا اور ننھی کو بہلا دیا گیا۔

دراصل ننھی کی پرورش میں اماں سے زیادہ آپا کا ہاتھ تھا' وہی اس کو مزیدار مزیدار کہانیاں سنایا کرتیں اور ہر روز ننھی اسکول سے آکر اپنا سارا وقت آپا ہی کے ساتھ گزارتی بلکہ جب آپا روٹی پکاتیں تو آخر میں ایک منی سی روٹی آپا ننھی سے پکواتیں' بس دونوں سہیلیوں کی طرح رہا کرتیں۔ آپا نے ہی خاندان کے رشتے اور دلچسپ قصے مزے لے لے کر ننھی کو سنائے تھے' ننھی کی زندگی میں پہلا المیہ آپا کی شادی تھی' دولہا بھائی اس کی ثریا آپا کو گھر سے ہی نہیں شہر سے بھی دور لے گئے' اس کی وہ آپا جو اس کا سب کچھ تھیں' ننھی اداس رہتی' اس کو اپنی آپا بہت یاد آتیں جو اس کو پریوں کی کہانیاں سنایا کرتی تھیں' وہ آپا جو اب ننھی کے بال بڑے ہونے پر دو چوٹیاں باندھ کر ننھی کے رنگ برنگے ربن باندھا کرتی تھیں۔ آپا جو اس کے لئے رنگ برنگ کے کلپ خریدا کرتیں' وہ آپا خود پری بن کر پرستان چلی گئیں۔ آپا کبھی کبھی پانچ چھ ماہ کے بعد گھر آتیں' شروع شروع میں تو وہ ننھی سے میٹھی باتیں کرتیں' اسے گلے سے لگا کر خوب پیار کرتیں لیکن دھیرے دھیرے آپا کی توجہ ننھی کی طرف سے ہٹنے لگی اور جب آپا اکیلی آتیں تو زیادہ وقت دولہا بھائی کو خط لکھنے میں لگاتیں۔ ننھی سوچا کرتی اب آپا کو ایک بڑا سا گڈا مل گیا ہے' وہ اس سے کھیلتی ہیں مگر آپا اس کے لئے لکھنؤ سے سوتی جاگتی گڑیا اور کرچ کی سفید گیند ضرور لاتیں اور ننھی بھی اپنی اس سوتی جاگتی گڑیا سے ایسے ہی پیار کرتی جیسے آپا اس کو چاہا کرتی تھیں' اس کے رنگ برنگے ربن باندھتی' اس کے بالوں میں برش کرتی اور اسے پریوں کی کہانیاں سنایا کرتی اور جب گڑیا کو اس کے پنگوڑے میں سلا دیتی تو اپنی سفید کرچ کی گیند سے کھیلا کرتی لیکن اس کے ذہن میں یہ خیال ضرور آتا کہ آپا کو دولہا بھائی مجھ سے بھی زیادہ اچھے لگتے ہیں مگر کیوں؟ آپا کے پیار میں وہ شدت نہیں رہی اور ان کے آنے میں وقفے بھی طویل ہونے لگے۔ ننھی بھی اب آپا سے اتنی مانوس نہ رہی تھی' اب ابا بھی اس کا خیال رکھتے تھے' وہ اب بڑی ہو رہی تھی۔ اسکول میں وہ اپنی سہیلیوں

کے ساتھ چیکنے لگی۔ اسکول میں پڑھائی کی طرف توجہ بٹی اور پھر کھیل وغیرہ نے آپا کی یاد دھندلانا شروع کردی۔ ادھر اسکول میں آپا جیسی **سہیلیاں** بھی تھیں جو قصے کہانیوں سے ننھی کو بہلانے لگیں۔ ننھی کو اسکول میں نکہت کے نام سے پکارا جاتا تھا اور اس کو اس بات کا احساس بھی ہونے لگا کہ اب وہ ننھی نہیں ہے بلکہ بڑی لڑکی ہوگئی ہے۔ ننھی اب جوان ہو رہی تھی۔ اسے احساس جوانی نسوانیت کے انداز میں نہیں تھا کیونکہ وہ سارے کھیل لڑکوں والے کھیلا کرتی **مثلاً** "گلی ڈنڈا' ہاکی اور کرکٹ۔ کون سا کھیل تھا جس میں نکہت شامل نہ ہو۔ محلے میں اگر کبڈی ہو رہی ہے تو نکہت **چاہتی** تھیں کہ اس میں بھی شامل ہوجائیں اگر کرکٹ گلی میں کھیلا جا رہا ہے تو وہ پہنچ جاتیں۔ ادھر اسکول ختم ہوا تو کالج میں داخلہ کرادیا ابا نے۔ وہاں طلعت اور شہلا سے ان کی دوستی ہوگئی گو کہ طلعت اور شہلا مزاجا" ایک دوسرے کی ضد تھیں اور نکہت بی بی بیچ میں ٹینس کی بال بنی ہوئی تھیں۔ کبھی طلعت کے بلے پر اور کبھی شہلا کے کورٹ میں' دراصل طلعت اور نکہت کے مضامین بھی ایک تھے اور شہلا کی خوبصورت آنکھوں نے نکہت کو اپنا دیوانہ بنایا ہوا تھا اور طلعت جو ایک گوری' نازک' دبلی پتلی سی کھلنڈری لڑکی تھی اور نکہت کو دیوانہ وار چاہتی تھی۔ نکہت شہلا کی سنجیدگی اور پروقار شخصیت پر دیوانی تھی۔ بس یہ کڑی ایک دوسرے سے کچھ اس طرح سے جڑی تھی' بیچ میں نکہت اور ادھر ادھر دونوں **سہیلیاں**۔ یہ تینوں لڑکیاں کالج میں لڑکوں کی توجہ کا مرکز بھی بننا شروع ہوگئیں۔ ایک صاحب زادے جن کا نام نکہت نے مہین رکھ دیا تھا بالکل منحنی قمیص اور پتلون پہن کر ایسے آتے تھے جیسے ابھی ابھی سنو وہائٹ سے کپڑے پہن کر نکلے ہیں اور ایک نیلی دھاری دار ٹائی اور اس کی میچنگ کے موزے اور پتلون ضرور پہنے ہوتے تھے۔ انہیں عشق کا بھوت سوار ہوا تو وہ بس ہسٹری کے نوٹس لینے یا دینے کے بہانے سے کامن روم کے دروازے پر کھڑے نظر آتے چونکہ طلعت اور نکہت نے بھی ہسٹری لی ہوئی تھی' بس وہ طلعت کو کوئی نہ کوئی عذر بنا کر بلاتے لیکن ساتھ ساتھ یاجوج ماجوج کی طرح نکہت بھی ہوتیں۔ وہ ہزار ریہرسل کرکے آتے کہ آج طلعت سے یہ کہنا ہے' وہ کہنا ہے لیکن ان کے تمام خواب بکھر جاتے' جب طلعت اور نکہت دونوں ہی دروازے سے نمودار ہوتیں اور یہ ندیم جن کا نام مہین پڑ گیا۔ نوٹس حوالے کرکے اپنی فائل بغل میں دبائے چپ چاپ چلے جاتے۔ یہ صاحب زادے پہلے کسی دفتر میں کلرکی کر آئے تھے تو شارٹ ہینڈ کی وجہ سے لیکچرار کے سارے نوٹس بنا لیا کرتے۔ طلعت اور نکہت ان سے لے کر ان کی نقل کرلیتیں اور یہ

روتے بسورتے واپس چلے جاتے۔ طلعت کو ان سے کوئی دلچسپی نہیں تھی' ذرا بھی کشش محسوس نہ کی۔ یہ بات سارے کالج میں آگ کی طرح پھیل گئی کہ ندیم طلعت سے والہانہ عشق کرتا ہے لیکن اظہار محبت کی ہمت نہیں ہے اور نکہت کباب میں ہڈی ہیں اور معاملہ آگے نہیں بڑھ پا رہا ہے۔ نکہت اچھی طرح جانتی تھی کہ طلعت ذرا بھی اس کو پسند نہیں کرتی ہے' رہیں شہلا صاحبہ ان کے بھی چاہنے والے پیدا ہونا شروع ہو گئے۔ وہ ایک پروقار شخصیت اور گندمی رنگ کی وجہ سے کئی شیدائی پیدا کر رہی تھیں لیکن وہ تو خود اپنی ایک سہیلی کے بھائی شہاب کو پسند کرتی تھیں۔ اب رہ گئیں نکہت عرف ننھی' یہ تو ان لڑکیوں میں سے تھی' جنہیں کبھی اپنی نسوانیت کا احساس بھی نہیں ہوا تھا۔ یہ ان میں سے تھیں جو ایک لڑکا اور ایک لڑکی سر جوڑے کھڑے دیکھ کر دلچسپ کہانیاں تخلیق کر لیا کرتیں اور اپنی ہم جولیوں کے گروپ میں مزے لے کر سنایا کرتیں' نہ تو ابھی تک ان پر کوئی **ریجھا** تھا اور نہ ہی انہوں نے کبھی سنجیدگی سے کسی لڑکے کی طرف یہ سوچ کر نظر اٹھائی اور یہ چار سال کالج میں ہنستے کھیلتے گزر گئے۔ شہلا نے بی اے کر کے تعلیم کو خیر باد کہا اور ان کی شادی کسٹم کے ڈائریکٹر سے کر دی گئی۔ شہلا نے بھی چوں چراں نہ کی کیونکہ ان کی سہیلی ناہید کے بھائی' جن کو یہ دل ہی دل میں دیوتا بنا کر بیٹھی تھیں' وہ کسی اور دیوی کے مندر میں پھول چڑھا رہے تھے' لہٰذا شہلا نے اپنی اس خاموش محبت کو اس امیر مٹی کے مادھو پر بھینٹ چڑھا کر شادی کر لی۔ یہ گیلو میاں شہلا کو بہت چاہتے تھے اور شہلا بھی ایک مشرقی بیوی کی طرح ان کی داسی بن گئیں' طلعت کے طلب گار بی اے کر کے کسی دفتر میں سینئر افسر بن کر چلے گئے۔ نکہت اور طلعت نے یونیورسٹی کی راہ لی۔ دونوں کسی بھی محبت کے چکروں میں نہ پڑیں' انہیں آپس میں گپوں اور کھیلوں نے فرصت ہی نہ دی' بس فلسفہ میں ایم اے کرنے کی ٹھان لی۔ فلسفہ ہے بھی کچھ ایسا خشک مضمون بس کہ کم طالب علم ہمت کرتے ہیں' اس کو لینے کی۔ آٹھ مشکل سے تھے بس ایک خاندان ہو جیسے سب بھائی بہن کی طرح برابر میں ایک اور ڈپارٹمنٹ تھا۔ وہ سائیکالوجی کا اس میں سے ایک لڑکا جس کا نام آفتاب تھا' وہ بھی آ کر ان کے ساتھ بیٹھ جایا کرتا لیکن ساری یونیورسٹی میں چیمپئن تھا۔ آفتاب کئی سال سے ٹیبل ٹینس کی چیمپئن شپ جیت رہا تھا۔ طلعت اور نکہت بھی بیڈمنٹن اور ٹیبل ٹینس کی شوقین تھیں۔ اپنے فری پیریڈ میں یہ کھیلنے چلی جاتیں' وہاں جم خانے میں کبھی کبھی آفتاب بھی نظر آتا۔

ہوا یوں کہ ایک دن طلعت اور نکہت ٹیبل ٹینس کھیل رہی تھیں۔ آفتاب نے طلعت

کے ہاتھ سے بیٹ لے لیا اور نکہت حیران رہ گئی کہ یہ چیمپئن اور میں اناڑی اس کے ساتھ کیا کھیلوں گی۔ وہ بڑی نروس لیکن کھیل جاری رہا۔ آفتاب نے اس کو ایک گیم دیا پھر دوسرا گیم اور پھر تیسرا گیم۔ تین چار گیم کھیل کر کہا نکہت آپ میرے ساتھ کھیلا کرو تم کو اس کھیل کا Hang Over آتا ہے۔ بہت جلدی آپ اس کی چیمپئن شپ جیت سکتی ہیں۔ اب جہاں جم خانے میں یہ دونوں لڑکیاں آئیں، آفتاب کو نہ جانے کیسے خبر ہو جاتی اور وہ آکر طلعت کے ہاتھ سے بیٹ لے لیتا۔ نکہت تو تھی ہی ٹیبل ٹینس کی شوقین ہاتھ جمنا شروع ہو گیا۔ ایک دن طلعت نے جم خانے میں کھیلتے ہوئے نکہت سے پوچھا تم کو آفتاب کیسا لگتا ہے، کہنے لگی مجھے تو بالکل سفید دھلی ماش کی دال لگتا ہے۔ ایک دم دھلا دھلا سا جیسے ابھی ابھی صابن سے منہ دھو کر آیا ہے۔ ارے نکہت تم تو بچپن ہی سے ماش کی دال نہیں کھاتی ہو ہاں یہ ہی تو میں کہہ رہی ہوں۔ اب تو آفتاب باقاعدگی سے جم خانے میں آتا۔ طلعت اور نکہت تو بیڈمنٹن بھی کھیلا کرتی تھیں۔ وہ طلعت کے ہاتھ سے بیڈمنٹن کا ریکٹ بھی لے لیا کرتا۔ نکہت تھوڑا دل میں پریشان رہنے لگی کہ یہ کیا ہو رہا ہے مگر آفتاب نے کبھی بھی نکہت سے اپنی پسندیدگی کا اظہار نہیں کیا، البتہ طلعت کو اشفاق اچھا لگنے لگا تھا جو اکثر آفتاب کے ساتھ جم خانے میں آتا اور بیڈمینٹن کے کورٹ میں کچھ اس بے نیازی سے داخل ہوتا اور پوچھتا کیا میں بھی اس کھیل میں شامل ہو سکتا ہوں۔ طلعت اس کی اسی ادا پر ریجھی ہوئی تھی مگر یہ بات زیادہ عرصہ نہ چل سکی۔ شاید اشفاق طلعت کی آنکھوں کے جذبہ کو نہ پڑھ سکا اور وہ جذبہ جو کبھی کبھی طلعت کے دل میں موجیں اٹھا رہا تھا، اندر اندر ہی بجھ کر رہ گیا۔ امتحان قریب آ رہے تھے، طلبہ نے لائبریریوں کی طرف اپنے قدم رواں دواں کر دیئے تھے نکہت بھی پڑھائی کی طرف راغب ہو رہی تھی لیکن طلعت کچھ افسردہ سی رہنے لگی تھی اور بار بار جم خانے جانے کی ضد کرتی۔ طلعت کی نکہت کے آگے کچھ نہ چلی وہ سیدھی سادھی لڑکی نکہت کی ڈانٹ پھٹکار میں آکر کتابیں لے کر بیٹھ گئی۔ ایک دن نکہت نے اسے بہت پیار سے سمجھایا کہ کس چکر میں پڑی ہو، امتحان قریب ہیں، ہماری ڈویژن پر اثر پڑ جائے گا اور اگر پریوئس میں نمبر کم آئے تو فائنل میں کیسے پوزیشن لیں گے۔ طلعت بے چاری نے ہتھیار ڈال دیئے اور کتابیں بغل میں دبائیں اور دونوں مل کر لائبریری کی طرف چل دیں، جہاں آفتاب اپنی سفید پتلون اور سفید قمیص میں بے حد اسمارٹ سامنے سے آتا ہوا دکھائی دیا۔ کہاں چلیں آیئے ذرا کینٹین میں چل کر چائے کا ایک دور ہو جائے نہیں بالکل وقت نہیں ہے، امتحان سر پر آگئے

ہیں ذرا بھی تیاری نہیں کی ہے، ہم دونوں لائبریری میں بیٹھ کر پڑھنا چاہتے ہیں۔ طلعت کو اس معصوم صورت پر رحم آگیا۔ آفتاب کی مسکین شکل دیکھ کر اس نے کہا نکہت چلو چائے نہ سہی ذرا سی دیر ویسے ہی کلاس روم میں بیٹھ جائیں۔ آفتاب کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا اور بولا دراصل مجھے نکہت آپ سے نہیں طلعت سے ہی کچھ بات کرنا ہے۔ نکہت نے مسکراتے ہوئے حامی بھرلی اور اپنی فائل لے کر پیچھے پڑی ہوئی میز پر بیٹھ گئی، جہاں طلعت کچھ گھبرائی سی آفتاب کے ساتھ کلاس روم میں داخل ہوگئی۔ وہ اندر ہی اندر سوچ رہی تھی کہ آج اشفاق نے اس کے ذریعے مجھے پیغام بھیجا ہے۔ دونوں سامنے پڑی ایک میز کے گرد خاموشی سے بیٹھ گئے۔

"فرمایئے آپ کو مجھ سے کیا ضرورت آپڑی ہے" طلعت نے پوچھا..... "تم کو معلوم ہے امتحان سر پر آگئے ہیں اور یہ لڑکی جو پیچھے بیٹھی کس بے نیازی سے نوٹس بنارہی ہے۔ یہ نکہت میرا خون چوس رہی ہے" کیا مطلب..... طلعت نے گھبرا کر پوچھا۔ "یہ جونک کی طرح میرا خون پی رہی ہے ساری ساری رات میرے ذہن پر چھائی رہتی ہے۔ میری بھوک پیاس اڑا دی ہے اس نے۔ تم لوگوں کا تو یہ پہلا سال ہے، میرا آنرز کا آخری سال ہے تم کو معلوم ہے کہ میں ٹاپ کرتا ہوں لیکن اس لڑکی نے میرا چین و قرار سب کچھ لوٹ لیا ہے صرف تم مجھے یہ بتادو کہ اس کی میری بارے میں کیا رائے ہے، خدارا اس سے معلوم کردو" ارے یہ تو عشق وشق کو مانتی ہی نہیں ہے، وہ کہتی ہے کہ یہ کالج کے لڑکے سب فلرٹ کرتے ہیں اگر ایسا ہی ایک دوسرے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے تو ماں باپ سے پیغام بھجوا کر شادی کرلیں۔ یہ شے ہی کوئی اور ہے، اس کو صرف کھیل اور پڑھنے سے دلچسپی ہے۔ "تم پتہ تو کرو طلعت" یہ کہتا ہوا وہ نکل گیا۔

"کیا سرگوشیاں ہورہی تھیں دونوں میں اشفاق راضی ہوگیا کیا کیا بتارہا تھا کچھ ہم بھی تو سنیں" نکہت نے اشتیاقانہ لہجہ میں پوچھا۔

"ارے نہیں پگلی وہ تو تیرے لئے آہیں بھر رہا تھا اور ہاں سن کہہ رہا تھا کہ تو بالکل جونک کی طرح اس کا خون پی رہی ہے۔ طلعت نے اس کے شانے پر پیار سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ارے وہ آفتاب وہ تو بالکل دھلی ماش کی دال ہے سفید بالکل ایک دم دودھ کی طرح شفاف دھلی دال کی طرح لگتا ہے بس اور کچھ نہیں۔" نکہت نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

"تم سے اشفاق کی بات نہیں کی ارے پاگل الو تو نے کچھ تو عندیہ معلوم کیا ہوتا۔ اشفاق

کی کسی اور لڑکی سے دوستی ہے یا وہ کبھی تیرے بارے میں کچھ پوچھتا ہے۔"
"نہیں یار وہ تو اس قدر تھکا ہوا نظر آرہا تھا' قریب سے جب میں نے اس کو دیکھا تو آنکھوں میں افسردگی اور تھکن نمایاں تھی جیسے کئی راتوں سے سویا نہ ہو۔" طلعت نے سمجھاتے ہوئے کہا۔ تم اس سے مل کر یہ کہہ دو کہ یہ نکہت تو بے حد بے حس لڑکی ہے۔ یہ صرف یونیورسٹی پڑھنے آتی ہے۔ تم اس کے لئے اپنا ایک لمحہ بھی ضائع نہ کرو۔ وہ تو تم کو ماش کی دال کہتی ہے۔ وہ بھی سفید دھلی ہوئی ماش کی دال اچھا چلو اب گھر چلیں۔ دونوں ہنستی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئیں۔
ان کا سینٹر انگلش ڈپارٹمنٹ پڑا تھا۔ یہ دونوں اپنا پہلا پرچہ ختم کرکے باہر نکل رہی تھیں' وہاں دروازے پر آفتاب ان کا منتظر تھا' ارے وہ دیکھو دھلی ماش کی دال یہاں کیا کر رہا ہے۔ جب یہ دونوں آگے بڑھیں' اس کی دھلی دھلی رنگت بالکل سفید اس پر شیو بڑھا ہوا جیسے واقعی کسی نے دال پر بگھار لگا دیا ہے لیکن پیاز جل گئی ہے دیکھو یہ مصیبت کیا کہتی ہے جب قریب پہنچی تو اس نے پوچھا آپ کے پرچے کیسے ہوئے صرف یہ پتہ کرنے آیا تھا۔ ٹھیک ہی ہو رہے ہیں اور آپ کے؟ نکہت نے بادل نخواستہ سوال کر ڈالا نکہت میں نے امتحان ہی نہیں دیا اچھا خدا حافظ اور وہ ایک دم مڑ گیا۔ نکہت کو پہلی مرتبہ اس پر رحم آیا۔
"کیا واقعی یہ مجھ سے محبت کرنے لگا ہے پھر وہ لبنیٰ ہے نا جو انگریزی میں آنرز کر رہی ہے کبھی کبھی یہ اس کے ساتھ بھی نظر آتا ہے۔" چلو چھوڑو آج امپائر میں انداز لگی ہے' وہ دیکھتے ہیں میٹنی شو آج آخری پرچہ تھا' لہٰذا دونوں نے فلم دیکھنے کا پروگرام بنا لیا دوسرے دن طلعت اپنی امی کے ساتھ چھٹیوں میں پنجاب چلی گئی۔ یونیورسٹی کے طلبہ نے ایک شام منائی' جس میں نکہت بھی وقت گزاری کے لئے پہنچ گئی۔ پارٹی ختم ہونے کے بعد جب نکہت نکلنے ہی والی تھی ارے نکہت رک جاؤ' اس نے پلٹ کر دیکھا تو لبنیٰ جو بے حد خوبصورت لگ رہی تھی اپنے کالے سوٹ میں ناگن کی طرح لہراتی ہوئی آئی۔
کیا بات ہے لبنیٰ آج تو نہ جانے کتنے مار گرائے ہوں گے تو نے تو..... نکہت نے اسے چھیڑا اللہ مجھے تنگ نہ کرو میں تم سے بات کرنا چاہتی ہوں لیکن موقع نہیں ملتا ہے۔ بہت ضروری کام ہے تم سے اور آج ہی بات کرنی ہے ورنہ پھر طویل چھٹیاں آرہی ہیں۔ یہ کہتے ہوئے دونوں پارک میں اک مہکتے ہوئے گلاب کی کیاری کے پاس بیٹھ گئیں۔ چلو بولو کیا ایسی بات ہے' جس کی ضرورت مجھ سے پڑ گئی نکہت نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ لبنیٰ نکہت کے اور

قریب کھسکی آج ایک بات مجھے سچ سچ بتادو کیا تم آفتاب سے محبت کرتی ہو؟ لبنیٰ نے اپنے دل پر سے ایسے بوجھ اتارا جیسے کوئی قلی بھاری بوجھ کو اپنے سر سے اتار کر سانس لیتا ہے۔ نکہت میرے دل پر بہت بوجھ ہے' میں بہت پریشان ہوں۔"

یہ کیا پوچھ رہی ہو؟ نکہت گھبرا سی گئی۔

"مجھے یہ بتادو خدارا" لبنیٰ کی آنکھوں میں پانی چمکنے لگا۔ "کچھ دیر دونوں خاموش رہیں" پھر لبنیٰ بولی جواب دو نا..... اتنی پراسرار نہ بنو نکہت میں آفتاب سے عشق کرتی ہوں' وہ میری زندگی ہے' وہ میرا ماضی ہے' میرا حال ہے' میرا مستقبل ہے' میرا سب کچھ ہے' میری رگ رگ میں سمایا ہوا ہے' وہ ایک سانس میں سب کچھ کہہ رہی تھی اور نکہت اس کو ہکا بکا دیکھ رہی تھی کہ یونیورسٹی کی سب سے خوبصورت لڑکی جو ساتھ ساتھ ذہین اور انتہائی فیشن ایبل بھی ہے' یہ سب کچھ مجھے کیوں بتا رہی ہے بے اختیارانہ اس کے منہ سے نکل ہی گیا۔ لبنیٰ یہ سب مجھے کیوں سنا رہی ہو مجھے ان باتوں میں ذرہ برابر بھی دلچسپی نہیں ہے۔ یہ تمہارا ذاتی معاملہ ہے لبنیٰ "نہیں نکہت یہ میرا ذاتی معاملہ ہی نہیں تمہارا بھی ذاتی معاملہ ہے تم بھی آفتاب کو بے تحاشا چاہتی ہو"" نہیں لبنیٰ بالکل نہ گھبراؤ وہ صرف تمہاری ملکیت ہے۔" نکہت نے بات کاٹتے ہوئے کہا لیکن وہ تو تم سے محبت کرتا ہے اور زندگی کے ہرباب کو تمہارے نام معنون کردیا ہے اس نے خود مجھے بتایا ہے وہ تو تمہارے نام کی مالا جپتا ہے مجھے بتادو نا ایسا کیا جادو تم نے کردیا ہے اس پر اس کی تو ساری کائنات تم ہو۔ "بس کرو بس کرو" نکہت نے کانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"ایک پل کے لئے چپ ہو جاؤ میری بھی سن لو لبنیٰ" نکہت نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

"پھر" لبنیٰ نے بیتاب ہو کر پوچھا۔

"وہ تو مجھے بالکل دھلی ماش کی دال لگتا ہے اور میں نے بچپن سے ہی یہ دال کبھی پسند نہیں کی۔" نکہت نے کہا لبنیٰ کو اپنے دل میں ایک ٹمٹماتی کرن دستک دیتی محسوس ہوئی۔

"نکہت تمہارے یونیورسٹی آنے سے پہلے ہم میں بے حد پیار تھا ساری یونیورسٹی میں یہ خبر پھیلی ہوئی تھی ہمارے سینوں میں ایک دوسرے کے لئے بے حد خلوص و محبت تھی۔"

آفتاب کبھی ٹیبل ٹینس کسی لڑکی کے ساتھ نہیں کھیلا کہ اس کا گیم خراب ہو جائے گا' وہ دن بہ دن گھلتا جارہا ہے۔ اس کی شادی اس کے گھر والے اپنے خاندان کی ایک لڑکی سے چاہتے ہیں۔ ہاں بھی اس نے کردیا ہے مجھ سے سیدھی بات نہیں کرتا ہے' بات بات پر

جھڑک دیتا ہے اور مجھ کو لبنیٰ تم مجھ کو بھول جاؤ میں کناڈا چلا جاؤں گا نکہت مجھے پسند ہے اس نے ٹیبل ٹینس اور بیڈ منٹن کھیل کر نہ جانے کون سا جادو کردیا ہے' میری روح میں سما گئی ہے۔ وہ بولتی ہے تو میرے کانوں میں جل ترنگ بجتے ہیں اور ہنستی ہے تو میرے ذہن کے تار جھنجنا اٹھتے ہیں وہ میرے خیالوں سے زیادہ مجھے ٹھنڈک پہنچاتی ہے' وہ بولتا چلا جاتا ہے' لبنیٰ سانس روکے بغیر بولے چلی جارہی تھی۔

"لیکن لبنیٰ میرے دل میں کوئی بھی تو جگہ نہیں ہے اس لئے کہ وہ دھلا دھلا سفید رنگ وہ سب کے سپنوں میں ہے لیکن میرے لئے تو صرف ایک دھلی ماش کی دال سے زیادہ کی بھی اہمیت نہیں رکھتا ہے جو مجھے بچپن سے پسند نہیں اس کو بتادو کہ مجھ سے اسے کچھ نہیں ملے گا اپنا وقت نہ ضائع کرو' مجھے گھر جانے کو دیر ہو رہی ہے ابا مجھے ڈانٹیں گے" شکریہ نکہت تم نے ماش کی دھلی دال پسند نہیں کی۔ میری پسندیدہ چیز ماش کی دال ہے' میں تو یہ دال کھاکر عمر گزار سکتی ہوں پرسوں ہی میں آفتاب کی دعوت کروں گی بتادوں گی کہ تم نے اس کو صرف دھلی ماش کی دال کہا جو تم نے کبھی بھی پسند نہیں کی۔ "ہاں ایک مرتبہ ابا کے لئے لی تھی مجھے بالکل پھیکی پھیکی بے مزہ لگی بالکل تمہاری طرح جو میری زندگی میں کبھی طلوع نہ ہوگا۔" نکہت یہ کہتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔

قاتل کون.........؟

اس کے رونے پیٹنے سے تمام ایئرپورٹ پر ایک ماتمی فضا چھائی ہوئی تھی۔
وہ عورت سفید چادر ڈالے نوحہ کناں تھی کیونکہ اس کی دنیا لٹ چکی تھی۔ چھوٹے چھوٹے معصوم بچوں کا اب کیا ہوگا جو اچانک یتیم ہوگئے تھے' اس کا سہاگ لٹ چکا تھا۔ چوڑیاں توڑ دی گئی تھیں' رنگین دوپٹہ اتار کر اس کو بیوگی کی چادر اڑھا دی گئی تھی' وہ اپنی ناک پونچھتی اور کبھی آنسوؤں کو اپنے آنچل سے خشک کرتی لیکن آنکھوں سے ایک سیلاب تھا کہ چھوٹا پڑتا تھا۔ برابر میں اس کا سامان بندھا ہوا رکھا تھا۔ میں بھی وہاں ایئرپورٹ پر اس کو الوداع کہنے کے لئے موجود تھی' خواتین جو اس کو رخصت کرنے کے لئے آئی تھیں' ان کے چہروں پر اداسی چھائی ہوئی تھی۔ اچانک وہ ایسا جملہ بول دیتی ہے کہ دل پر گھونسہ سا لگ جاتا ہے' اس کی چیخ سے اس کے بچے بھی گھبرا جاتے "ارے یہ نئی گاڑی منحوس نکلی' میں منع کرتی تھی نہ لو لیکن مرحوم کو مرسڈیز کی بڑی خواہش تھی' کہتے تھے کہ بچوں کو شوق ہے' تم نے میرا کہنا نہیں مانا اور مجھے اس بھری دنیا میں کس پر چھوڑ گئے ہو' میں کیسے سنبھالوں گی؟"
اور دھیرے دھیرے آواز دب جاتی اور پھر سسکیوں میں تبدیل ہو جاتی۔ بوڑھی ساس جو خود ہی اپنے جوان بیٹے کی موت سے ٹوٹ چکی تھی' بیوہ کو گلے سے لگاتی' میری بچی' صبر کر صبر! مجھے دیکھ اس بڑھاپے میں کیسا جوان پہاڑ سا بیٹا کھو کر صبر کی پتلی بنی بیٹھی ہوں۔ خدا اولاد کا دکھ کسی ماں کو نہ دے۔

"ارے اماں میرا ہیرا گم ہوگیا۔ پھر کہتی ہائے میں نے اس کی قدر نہ کی۔ ایک مجمع اکٹھا تھا۔ وہ لاش کے ساتھ پاکستان جا رہی تھی۔ منی جو ابھی مشکل سے پانچ سال کی ہوگی' ماں کو پیار کرتی پھر اپنی فراک کے دامن سے ماں کے آنسو پونچھتی اور پھر دادی کی گود میں بیٹھ جاتی۔ دادی اماں امی کو چپ کراؤنا' یہ بھی نہ مرجائے ابو کی طرح۔ بھیا دوڑ کر ماں کے پاس آتا۔ امی خدا کے لئے اتنا مت رو۔ تمہاری طبیعت خراب ہو جائے گی' وہ تو ہو بہو باپ کی شکل تھا۔

برابر ہی بیٹھی ایک عورت بولتی ارے دیکھو نا یہ تو اکمل بھائی کی طرح لگتا ہے۔ ادھر گلو جو مشکل سے گیارہ سال کا ہوگا' الگ کرسی پر بیٹھا جیسے اس کا خلاؤں میں گم چہرہ اس بات کی غمازی کر رہا ہو کہ یہ سارا بوجھ تو میرے اوپر آگرا ہے' اس پر ایک عورت اٹھ کر روتی ہوئی عورت کے پاس تسلی کے بول بولتی ارے کیوں رو کر اپنے کو ہلکان کرتی ہے تیرے پاس تو یہ دو آنکھیں ہیں' ان لاٹھیوں کو تھام لے خدا کی امانت تھی اس نے لے لی۔

گلو نے اٹھ کر جیب سے رومال نکالا۔ ہاں ماں ہم تیری بیساکھیاں ہیں' ہمارے لئے زندہ رہو' اس نے ماں کی آنکھوں کو پونچھتے ہوئے کہا۔ بس اب پرواز کا وقت ہونے والا ہے' اس نے جملہ بھی ختم نہ کیا تھا کہ ہوائی جہاز میں بیٹھنے کا اعلان ہوگیا۔ میں نے جاکر خدا حافظ کہا بچوں کے سر پر ہاتھ رکھا لیکن میرے ہاتھ کانپ رہے تھے' اپنے جذبات کو روکا اور اپنی گاڑی کی طرف آئی گاڑی اسٹارٹ کی۔ ہوائی اڈہ شہر سے بہت دور تھا۔ سب اداس اپنے گھروں کو واپس لوٹے' میں گاڑی چلا رہی تھی لیکن میرا ذہن مجھے ان وادیوں میں لے گیا' جہاں سے اس المیے کی ابتدا ہوئی۔ وہ گھر جہاں ایک خوشحال خاندان رہا کرتا تھا' ہر روز روز عید اور ہر شب شب برات تھی' یہ عورت جو آج محرم کا تعزیہ بنی بیٹھی تھی' کس فخر سے چلا کرتی تھی جیسے قلوپطرہ ہو کسی کو منہ نہ لگانا' اس کا شیوہ تھا۔ شوہر اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھ کر سوچتا۔ اس کی بغیر مرضی اس گھر میں پتا بھی نہیں ہل سکتا تھا۔ یہ سب کیا ہوگیا۔ میں نے ذہن کو جھٹکا اور پھر حال میں واپس آنے کی کوشش کی۔ ارے پرسوں ترسوں کی بات ہے' جب میں پرسے کے لئے ان کے گھر گئی' وہاں پر منسٹری کے لوگ مسز اکمل سے کہہ رہے تھے بی بی آپ ایک دو روز میں یہ مکان خالی کردیں' اس میں دوسرے چیف انجینئر صاحب کو منتقل ہونا ہے' وہ ہوٹل میں ہیں۔ اندر داخل ہوئی' جہاں ملازمین قالین لپیٹ رہے تھے' کوئی پردے اتار رہا تھا تو کوئی خاتون بستر سے تکیہ کے غلاف و کشن کو کارٹن میں جمارہی تھیں۔

کیسا گھر اجڑا۔ ہر چیز جیسے ٹوٹ کر بکھر رہی تھی' کبھی بچوں کے پاس ہونے پر خوشیاں منارہی ہے۔ اگر سالگرہ آئی تو ہزار لوگ جمع کرلئے اور اسی گھر کو بقعہ نور بنالیا۔ اپنی شادی کی سالگرہ پر ایسے کپڑے پہنے کہ سلیم اور انار کلی بھی رشک کریں' ان کی سجاوٹ اور حسن پر ذہن پر منظر بدل رہے تھے اور ایسا لگ رہا تھا کہ اکمل ابھی ابھی ایک دم اٹھ کر مسکراتے ہوئے آئیں گے ارے بھابھی کیسی ہیں اور پھر مسکراکر..... لو بھئی ایک اور واقعہ ذہن میں سنسنی پیدا کرنے لگا۔ چند روز بلکہ چند ہفتوں ہی کا تو ذکر ہے۔

میری کلاس دس بجے ختم ہوئی اور پانچ منٹ میں اجمل صاحب کے گھر پہنچ گئی۔ مسز اجمل بہت ہی ملنسار خاتون تھیں' میری ان سے اچھی خاصی شناسائی تھی۔ راستہ میں گھر تھا واپسی پر رکشہ میں ان کے ساتھ جاکر چائے پی لیا کرتی۔ وہاں گھواج میں دو گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ایک کالی مرسڈیز اور دوسری سفید وہیں پیچھے جاکر میں نے اپنی پجو رو کھڑی کردی جو ان دو شاہانہ گاڑیوں کے سامنے بڑی حقیر سی لگی۔ میں نے احساس کو ٹالا۔ کام تو تینوں گاڑیاں ایک جیسا کرتی ہیں اپنی منزل تک پہنچا دیتی ہیں بلکہ اپنی گاڑی کے چوری ہونے کا بھی کھٹکا نہیں خیال کو ذہن سے ماتھے کی لٹ کی طرح پیچھے ہٹاتے ہوئے' میں ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔ "تو آگئیں زرینہ چائے پینے" مسز اجمل نے مسکراتے ہوئے میرا استقبال کیا۔ "میں تو انتظار ہی کر رہی تھی آج جمعرات ہے تمہاری دس بجے کلاس ختم ہوتی ہے نا۔ السلام علیکم' وہاں سامنے اکمل بھائی اور اجمل بھائی دونوں ہی ساتھ ساتھ بیٹھے تھے' بڑے اچھے لگ رہے تھے۔ اجمل بھائی کے چہرے پر ایک نور برستا تھا جانے کیوں اور وہ تھے بھی ایسی پوسٹ پر۔ اکمل بھائی کریم کلر کے شلوار قمیض میں ایک شہزادے لگا کرتے تھے۔

میں نے سلام کیا۔ ارے ہاں بھابھی ہمیں چائے پلا دیجئے' مجھے ڈاکٹر زیگن کے پاس جانا ہے تو اس کو شاپنگ کرانی ہے یعنی اس کی بیوی کو ان کے پاس گاڑی نہیں ہے نا۔ ارے یہ تم لیکچرار کے ساتھ ساتھ سوشل ورکر کیوں بنی پھرتی ہو تمہاری اپنی ذمہ داریاں کچھ کم ہیں۔ بچے' گھر' سودا' کالج ارے ہاں وہ سراج اور ان کی بیوی آئے تھے' رات کو کہہ رہے تھے کہ اس شہر میں دکانوں میں کوئی نئی چیز آئے تو بس زرینہ بھابھی سے پوچھ لو اور یہ ہی نہیں بلکہ خرید کر بھی لادیں گی۔ کسی کو ہسپتال لے جانا ہو تو وہاں بھی۔ چلئے چھوڑیئے چائے پلایئے اور ہاں وہ کہہ رہی تھیں کہ وہ جعفری صاحب جو یہاں سے سو میل دور رہتے ہیں' ان کو اپنے گھر لاکر رکھا۔ ان کے ہاں ڈلیوری ہونے والی تھی رات گئے۔ ڈاکٹر رشیدہ کو لاکر سارا بندوبست کیا اور ایک ہفتے کے بعد گھر چھوڑ کر آئی۔ بہت قصیدہ خوانی ہوچکی۔ بھابھی مجھے جانا ہے۔ ارے ہاں یاد آیا یہ اکمل کے پیٹ میں کچھ تکلیف رہتی ہے۔ ایک دن مجھ سے کہہ رہے تھے کہ بھابھی زرینہ تو سب کا کچھ نہ کچھ کرتی ہیں' ان کی ڈاکٹر زیگن کی فیملی سے دوستی ہے مجھے دکھادیں لے جاکر۔ لو بھائی بیٹھے ہیں ارے اکمل یہ زرینہ سے خود ہی بات کرلو شرماتے کیوں ہو۔

"جی اکمل بھائی کیا بات ہے" میں نے پوچھا۔

"بات یہ ہے کہ زرینہ بھابھی میں نے بہت علاج کرائے لیکن میرے پیٹ کی تکلیف ٹھیک نہیں ہوئی۔ ڈاکٹر زیگن آیا ہے' اس کا شہر میں بڑا چرچا ہے لیکن مصروف ہے اور میرا درد کسی طرح جاتا نہیں۔ ہاں میں دکھادوں گی۔ میں نے جواب دیا۔

ہماری بیگم صاحبہ تو کسی بات کو سنجیدہ لیتی ہی نہیں "ہاں دیر تو ہو گئی مسز زیگن! لیکن آپ کے لئے اس شہر کا سب سے بڑا الیکٹریشن لے کر آئی ہوں یعنی یہاں کا چیف انجینئر جو نائجیریا میں 20 سال سے رہ رہا ہے۔"

اچھا گرمی ہے کچھ ٹھنڈا تو پی لو پہلے یا چائے۔"

ٹھنڈا کہاں؟ آپ کا تو فرج ہی کام نہیں کر رہا ہے۔ میں نے ہنس کر کہا چائے وغیرہ چھوڑیئے اپنا مسئلہ بتایئے۔

"ادھر آیئے" مسز زیگن ان کو اپنا ایئر کنڈیشن اور فرج دکھانے لے گئیں۔"

میں خوش تھی کہ ایک تیر سے دو شکار۔ دونوں کا کام ہو گیا۔

اچھا تو میں مزدوروں کو آج ہی بھیج دوں گا۔ وہ سب ٹھیک کردیں گے۔ یہ کہتے ہوئے اکمل باہر نکلے۔

"چلئے جناب مجھے بچوں کو لینا ہے" میں نے ہنس کر کہا۔

ارے بھابھی پہلے مجھے گھر چھوڑ دیں ورنہ میری بیوی تو ہنگامہ برپا کردے گی سارے شہر میں خبر ہو جائے گی کہ آج بیگم اکمل اپنے بچوں کو اسکول لینے گئیں۔ ارے معاف کیجئے گا دل کی بات زبان پر آ گئی۔ اکمل نے جھینپتے ہوئے کہا۔

ڈاکٹر زیگن کے وارڈ میں ایک بھیڑ تھی' میں ہجوم کو چیرتی پھاڑتی آگے بڑھی۔ ایک نوٹ لکھ کر نرس کو پکڑا دیا۔

ابھی اکمل بھائی مجھ تک پہنچ بھی نہ پائے کہ ڈاکٹر زیگن باہر نکل آئے۔

"کیا بات ہے خیریت" انہوں نے پوچھا۔

یہ ہمارے ملنے والے ہیں اکمل صاحب یہاں کے پرانے چیف انجینئر ہیں' آپ کو فرج اور ایئر کنڈیشن کا مسئلہ تھا ان سے بات کرلیجئے۔

"اندر آجایئے آپ دونوں" ڈاکٹر زیگن نے کہا۔

کرسی پر بٹھاتے ہوئے زیگن بولے یہ خاتون بہت عظیم سارے جہاں کا دوران کے جگر میں ہے۔

لیجئے درد کی بات ہو رہی ہے تو ان کے پیٹ میں سخت درد ہے اور آپ ڈاکٹر ہیں نا تو درد کی بات کرتے ہیں۔ ان کو دیکھئے "مجھے اکمل کہتے ہیں آپ ابھی مصروف ہیں۔ میں پھر آجاؤں گا۔" شرمندگی مٹاتے ہوئے اکمل بولے۔

"ارے نہیں ادھر آیئے زرینہ کے مریض کو میں فوراً" دیکھوں گا۔" انہوں نے ہنس کر کہا۔

میں اٹھ کر باہر آئی اور ٹہلنے لگی۔ میرے ذہن میں تھا کہ ابھی بچوں کو اسکول سے لینا ہے فوراً" اکمل بھائی نظر آئے۔

"چلئے اگر ان کے گھر بھی ہو لیں وقت ہے" اکمل نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔

"آپ بھابھی سے اتنا ہی ڈرتے ہیں یا ڈرامہ کرتے ہیں۔" میں نے پوچھا۔ "سب کی بیویاں آپ کی جیسی تھوڑی ہیں۔ سارا گھر اکیلی جان سنبھالے ہوئے ہے اور ہم زمانے بھر کے غم بھی اپنے دامن میں سمیٹ لیتے ہیں۔"

"اچھا یہ بتایئے کہ ڈاکٹر زیگن نے کیا کہا۔" میں نے بے چین ہو کر پوچھا۔

"کل بلایا ہے، تفصیل سے معائنہ کریں گے۔"

چلئے آپ کے بچوں کو بھی اسکول سے لے لیں اور میں بھی اپنے بچے لے لوں گی۔"

"ہاں ٹھیک ہے منی کی سالگرہ ہے، اگلے ہفتے تو بیوی تو آج کل اس ہنگامے کی تیاریوں میں ہے۔" انہوں نے ہنس کر کہا۔

ایک دن پھر میں مسز اجمل کے گھر جا دھمکی اور ہاں وہ بھابھی سے باتیں کر رہے تھے۔

"ارے بھئی اکمل بھائی ڈاکٹر زیگن نے کیا بتایا۔"

"بس زرینہ بھابھی وہی جس کا مجھے خطرہ تھا کہ تم کو السر ہے۔ اور خط دیا ہے کہ ابادان جاؤ وہاں پر اسپیشلسٹ کے پاس بھیجا ہے۔"

"آپ جایئے نا صحت کا خیال رکھئے۔ یہ ملک صرف پیسے کمانے کے لئے نہیں ہے۔" میں نے بے تکلفی برتنے کی کوشش کی۔

بس گھر کے مسائل ہیں ادھر منی کی سالگرہ ہے، اچھا میں چلتا ہوں، مجھے کام ہے۔

وہ تو ایک دم نکل گئے۔

زرینہ یہ ابھی اکمل مجھ سے کہہ رہا تھا کہ وہ جو اس دن شمو کی سالگرہ میں آپ کے یہاں گلاب جامن اور نمک پارے کھائے تھے، بہت مزیدار تھے، کس نے بنائے تھے۔ زرینہ میں

نے بتادیا کہ تم نے۔

"وہ کہتا تھا کہ کیا ممکن ہے کہ نمک پارے زرینہ بھابھی میرے لئے بنادیں' میں روزانہ تھوڑے سے قلفی دان میں رکھ کر دفتر لے جایا کروں گا۔ چائے کے ساتھ۔ منی کی سالگرہ کے بہانے سے بنوا دیجئے۔"

"ہاں بھابھی میں اکمل بھائی کی فرمائش پوری کردوں گی۔ اچھا چلوں گی' خدا حافظ بھابھی۔"

دوسرے روز اتوار تھا صبح دس بجے گھنٹی بجی۔ سفید پجیرو پھاٹک سے داخل ہوئی' اس میں سے جیسے شہزادہ سلیم اترا وہی سفید کرتا اور شلوار۔ ہم لوگ ابھی چائے کی میز پر ہی بیٹھے تھے۔ میرے منہ سے نکلا ارے صبح صبح شہزادہ سلیم ہمارے گھر کہاں سے آگیا۔

"ابھی تک تم اپنے کو انار کلی سمجھتی رہنا اور شہزادہ سلیم کے خواب دیکھتی رہو۔" میرے شوہر وسیم نے اکبر بادشاہ کے دبنگ لہجے میں طنز کیا۔

"بھابھی یہ لیجئے ایک پیکٹ اور گھی کا ڈبہ بھابھی نے بھیجا ہے آپ کے لئے۔

مجھے آنکھوں آنکھوں میں پیغام مل چکا تھا۔ ایک ہی پیکٹ میں نے زور ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"دوسرا گاڑی میں ہے بہت کام ہوجائے گا آپ کے نرم و نازک ہاتھ دکھ جائیں گے بیلتے بیلتے۔"

"جائیے کیا یاد کریں گے بنادوں گی۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"بس تھوڑے سے دفتر لے جایا کروں گا چائے کے ساتھ بہت مزہ دیتے ہیں۔ اتنے سینی بھر کر جتنے بھابھی کے لئے بنائے تھے۔

"جی ہاں اتنے ہی اور ویسے ہی چٹ پٹے ہوں گے۔"

"مگر میرا حصہ الگ رکھ دیجئے گا' یہ لیجئے میں اس کے لئے ایک ڈبا الگ لایا ہوں"

"اچھا تو پوری تیاری سے آئے بلا وجہ ہی تکلف برت رہے تھے۔"

میں نے قہقہہ لگایا "شکریہ" بھابھی۔

"آپ ابادان کب جارہے ہیں" میں نے سنجیدگی اختیار کی۔

"بس منی کی سالگرہ کے دوسرے روز ضرور ضرور چلا جاؤں گا۔ آپ کا اصرار ہے نا" اکمل نے کہا۔

ہم لوگ سالگرہ میں گئے حسب معمول جشن بہت کامیاب رہا اور رات گئے خوشی خوشی سب واپس آئے اور انہوں نے نمک پارے رکھ لئے شکریہ بھی ادا کیا۔

اچانک ایک خبر سارے شہر کو اداس کر گئی معلوم ہوا کہ اکمل بھائی کی لاش رات 2 بجے ہسپتال لائی گئی' وہ ابادان جارہے تھے۔ جہاز نہ ملنے کی وجہ سے انہوں نے گاڑی کرایہ پر لی ساتھ میں ایک سری لنکن بھی تھا۔ وہ تو راستہ میں اتنا سخت قسم کا حادثہ ہوا کہ چار گھنٹے تک لاش سڑک پر پڑی رہی

اور ٹی وی پر اعلان ہوا تو اجمل بھائی کا ایک چیف نائجیرین ٹی وی پر خبریں سن رہا تھا اور اجمل انصاری کے نام پر چونکا تو فوراً" جائے واردات پر پہنچا اور ڈرائیور سے خبر بھجوائی' وہ شام کو ہی روانہ ہو گئے۔ ڈاکٹر زیگن کو بھی ساتھ لے گئے تھے' وہاں ہسپتال پہنچنے سے پہلے ہی راستے میں دم توڑ دیا۔

ہم لوگ فوراً" پہنچے معلوم ہوا کہ وہ اس لائق بھی نہیں کہ کوئی صورت دیکھ سکے۔ میں ڈاکٹر زیگن کے پاس گئی اس نے وہاں سے ہم کو ہٹا دیا۔

"ڈاکٹر زیگن میں ان کی قاتل ہوں" میں نے رو رو کر کہا۔

نہیں زرینہ میں سوچ رہا ہوں کہ میں ان کا قاتل ہوں' میں نے اتنا اصرار کیا جب بھی ملاقات ہوتی کہتا کہ آپ اباڈان جایئے۔ "جی ہاں وہ تو ٹال رہے تھے۔"

میں ان سے ایک دن راستے میں ملی تھی تو کہنے لگے' میں جانے سے پہلے اپنی ماں سے ملنا چاہتا ہوں' ان کو آم پسند ہیں' راستہ میں آم دیتا جاؤں گا اور وہاں جہاز نہیں جاتا ہے' اس لئے انہوں نے ٹیکسی کر لی۔

"اف اللہ یہ کیا ہو گیا! نہ میں اس دن اجمل بھائی کے گھر کلاس لے کر پہنچتی اور نہ ہی وہ مجھ سے آپ کو دکھانے کی فرمائش کرتے۔"

ہائے میں ان کی قاتل ہوں۔

نہیں ایسا نہ کہو کتنے اچھے انسان تھے زیگن نے کہا۔

میں باہر نکلی بچے بھائی سب لاش کے ارد گرد کھڑے ماتم کناں تھے اور میں ایک ایک کے سر پر ہاتھ رکھ رہی تھی۔

یہ ہاتھ تمہارے باپ کے قاتل ہیں۔ وہ نمک پارے کتنے منحوس تھے جو ان ہاتھوں نے بنائے یہ وہی ہاتھ ہیں' جن سے گاڑی چلا کر میں اکمل کو ڈاکٹر زیگن کے پاس لے گئی تھی۔

یہ ہاتھ اکمل کے خون سے رنگے ہوئے ہیں۔ میں نے نمک پارے بنانے کا خیال بھی دل سے نکال دیا ہے۔

گاڑی گھر کے پھاٹک میں داخل ہوئی۔

وسیم نے پوچھا "وہ لوگ پاکستان چلے گئے۔"

"ہاں" لیکن اکمل کا قاتل ٹیکسی ڈرائیور ہے یا میں یا ڈاکٹر زیگن؟ اس سوال کا جواب مجھے آج تک میرا دل نہیں دے سکا ہے۔ قاتل کون؟

بھکارن

جب بھی مجھے وہ لڑکی نظر آتی' اس کی آنکھوں میں ایک التجا رقص کرتی۔ میرے ذہن میں یہ بات بہت مضبوطی سے نقش ہوگئی تھی کہ یہ لڑکی ہر ایک سے رحم کی بھیک مانگتی ہے۔ اس کے چہرے کے نقوش بھی اس طرح سمٹ سے جاتے کہ مجھے توجہ دو اور میری جھولی میں ہمدردیاں ڈال دو۔ وہ مجھے آتے جاتے سلام کرتی اور میں بھی سلام کا جواب کچھ اس طرح دیتی جیسے کسی نودولیتے نے غرور سے ایک پیسہ دھتکار کر فقیر کی طرف پھینک دیا ہو۔ وہ مجھے کبھی کینٹین میں ایک بھیڑ میں نظر آتی اور اس کی آنکھوں میں محرومی' یتیمی' برستی اور یہ معلوم ہوتا کہ یہ ایک بہت بڑی اداکارہ ہے جو اپنی آنکھوں میں اور چہرے پر ایسے تاثرات لا کر سب کی توجہ اور ہمدردیاں حاصل کرنا چاہتی ہے۔ مجھے اس سے معمولی بغض تھا اور میں خود اپنے اس احساس کا تجزیہ نہیں کرسکی تھی اور اتنا ہی وہ میری توجہ کی محتاج تھی۔

کبھی کبھی اسٹاف روم کے دروازے پر دستک ہوتی تو معلوم ہوتا کہ مینا مجھے بلا رہی ہے۔ میں بادل نخواستہ اس کے پاس جاتی اور اپنی طرف ایسا رویہ رکھتی کہ وہ یہ محسوس کرے کہ میں اس کو پسند نہیں کرتی ہوں لیکن وہ مجھے وقتاً ''فوقتاً'' ادھر ادھر ضرور نظر آتی۔ یہ 13 سال کی نوعمر لڑکی بہانہ تراش کر ضرور مجھ سے مخاطب ہوتی لیکن مجھے ایک کراہت سی محسوس ہوتی' اس کی لجی لجائی شخصیت سے میں روز بروز متنفر ہوتی جارہی تھی لیکن اس کی سفید دھلی دھلی آنکھوں میں کالی کالی پتلیاں مچھلیوں کی طرح تیرتی نظر آتیں اور ان آنکھوں میں ایک پیغام ایک درخواست کہ میری طرف مخاطب ہوں' خدارا مجھ پر رحم کھائیں اور اس کو میں اور بھی حقارت کی نظر سے دیکھتی گزر جاتی۔ اس کے ساتھ کبھی کبھی پر وقار لڑکی سیما ہوتی جو انتہائی سنجیدہ لڑکی تھی لیکن ایسا معلوم ہوتا کہ سیما اور میں مینا کے سلسلے میں بالکل ایک ہی رائے رکھتے ہیں۔

ایک دن سائنس کے ٹیچر نے مجھ سے کہا کہ مینا انگریزی زبان میں عبور نہ رکھنے کی وجہ

سے جماعت میں احساس کمتری کا شکار ہے۔ میں نے اس کو مشورہ دیا کہ میں ایک دن ان کی جماعت میں جا کر مشاہدہ کروں گی۔ میں ایک روز وہاں گئی سائنس ٹیچر پریکٹیکل سائنس میں کوئی تجربہ کروا رہے تھے۔ میں نے وہاں بیٹھ کر ایک جائزہ لیا۔ جب یہ لڑکی کسی سے کوئی سوال کرتی یا تو طالب علم اس کو نظرانداز کرتے یا ڈانٹ کر بھگا دیتے اور یہ خاموش ہو کر اپنی سیٹ پر بیٹھ جاتی۔ البتہ سائنس کا ٹیچر آکر اسے سمجھاتا تو چند لمحوں کے لئے اس کے چہرے پر تبسم نمودار ہوتا لیکن بہت جلد ہی وہ پھر اپنے پرانے رویہ پر واپس آجاتی۔

اب وہ آکر مجھ سے ان لڑکیوں کی شکایت بھی کرنے لگی اور اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک آتے۔ ایک دن لائبریری میں یہ جماعت انگریزی کے پیریڈ میں وہاں موجود تھی، میں کسی کام سے وہاں گئی مینا کے ٹیچر نے مجھے ایک طرف بلایا۔

"کیا تم مینا کی مدد کر سکتی ہو اس کو آئے ہوئے ایک سال ہو گیا ہے لیکن اس کی انگریزی میں ذرا سی بھی ترقی نہیں ہو رہی ہے۔"

"کیوں؟" میں نے پوچھا

"اس لڑکی کی کسی سے دوستی نہیں ہے۔"

میں نے تمام کام چھوڑا اور مینا کے پاس جا کر کہا "ادھر میرے پاس آؤ" اور اس کو لائبریری کے ایک کونے میں لے گئی۔

"مینا، تم آج روئیں نہیں کیا بات ہے؟" اس کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔ "مس میرا کوئی دوست نہیں ہے۔ میری کوئی مدد نہیں کرتا۔ میں بالکل اکیلی ہوں۔"

تم اتنی بڑی دنیا میں یعنی اس اسکول میں اتنی آبادی ہے۔ تمہاری کسی سے دوستی نہیں ہے۔

"مجھے کلاس میں کوئی بھی پسند نہیں کرتا۔"

"تم نے کبھی آئینہ دیکھا ہے؟"

"جی ہاں دیکھا ہے۔"

"کبھی اپنے آپ سے سوال کیا ہے کہ تمہارا کوئی دوست نہیں ہے۔ تم بھی کسی کی دوست ہو۔ تم کو کسی کی پرواہ نہیں ہے تم صرف اپنے بارے میں سوچتی ہو اپنا خیال ہے۔ اس لئے تم اکیلی ہو۔"

"مس مجھ سے کوئی بات نہیں کرتا، جب میں کسی کے پاس کھڑی ہوتی ہوں تو مجھے سب نظرانداز کرتے ہیں اور کبھی کبھی کچھ لڑکیاں کہتی ہیں کہ ہمارے پاس سے جاؤ۔ مس یہ سب

لوگ ظالم ہیں اور گھر میں؟ گھر میں ابا کو فرصت نہیں ہے' وہ باہر کام پر جاتے ہیں۔ امی کو باورچی خانے اور ننھے بچوں سے فرصت نہیں ہے' وہ تو مجھے اس وقت پکارتی ہیں جب گھر کا کوئی کام ہو۔"

"تم گھر میں کام کرتی ہو؟"

"جی ہاں میں ماں کی رسوئی میں مدد کرتی ہوں۔ بس پھر اسکول سے جو ہوم ورک ملتا ہے وہ کرتی ہوں' جب میں اسکول کام لاتی ہوں تو چند لڑکیاں پوچھتی ہیں کام کرلیا۔ اگر میں کہوں کہ ہاں تو وہ کہتی ہیں' تم نے ہم کو جلانے کو کیا ہے اور کہوں کہ نہیں تو کہتی ہیں کہ تم کو کچھ نہیں آتا۔ تم انتہائی نالائق ہو اور میں رونے لگتی ہوں تو وہ ہنس کر بھاگ جاتی ہیں اور یا آکر مجھے ستاتی ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں" اور یہ کہہ کر وہ پھر رونے لگی۔

"مینا تم جانتی ہو کہ تم کمزور ہو انگریزی میں نہیں بلکہ ایک کمزور شخصیت ہو۔"

"مس میری صحت بالکل ٹھیک ہے۔"

"نہیں لڑکی سنو جیسے ایک چیونٹی ہے اور ہم اس کو اپنے قدموں سے کچلتے ہوئے چلے جاتے ہیں لیکن اگر کوئی بڑا کیڑا ہو یا جانور تو ہم اسے اپنے پاؤں تلے نہیں روندیں گے تم بھکارن نہ بنو' ان سے رحم کی بھیک نہ مانگو تم نے ہندوستان' پاکستان میں دیکھا ہوگا' جب راستہ میں فقیر بھیک کے لئے ہاتھ پھیلاتا ہے تو کوئی تو حقارت سے پیسہ اس کی جھولی میں ڈال دیتا ہے اور کچھ لوگ دھتکار کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ بس تم خود ترسی کا شکار ہو۔ فقیر نہ بنو' کتابوں سے دوستی کرو' وہ تم کو نہیں ڈانٹیں گی اور نہ ہی دھتکاریں گی۔ اپنی شخصیت میں بے نیازی پیدا کرو۔ تم کو معلوم ہے کہ یونان میں اسپارٹا میں فوج کے لئے جب بچوں کو تربیت دی جاتی تھی تو کمزور بچوں کو پہاڑ پر سے لڑھکا کر نیچے پھینک دیا جاتا تھا اور وہ بچے جو مضبوط ہوتے تھے' ان کو تربیت دی جاتی تھی۔"

"ہاں! آپ نے یہ کہانی مجھے پہلے بھی سنائی تھی۔ اب میں کبھی نہیں رویا کروں گی اور **گھگھیا** کر لوگوں کے سامنے مدد کے لئے نہیں جاؤں گی۔ میں وعدہ کرتی ہوں' اب یہ لڑکیاں خود مجھے آکر سلام کیا کریں گی۔"

"نہیں یہ مطلب نہیں کہ تم ان سب کو نظرانداز کرو' نہیں تم ان کی خیریت پوچھو ان کے معاملات میں دلچسپی لو **مثلاً**" اگر کسی نے اچھے کپڑے پہنے ہیں تو ان سے اس کی تعریف کرو۔ یہ ملک ایسا ہے کہ یہاں اپنے پاؤں پر خود کھڑا ہونا پڑتا ہے بیساکھیاں زندگی میں سہارا

نہیں بنا کرتی ہیں۔ مطالعہ سے جو طاقت آئے گی، وہ تمہارے لئے ایسا اوزار ہیں کہ یہ سب تمہارے آگے سرخم کردیں گی۔ اب ہفتہ میں تم کو ایک گھنٹہ میں پڑھاؤں گی۔"

"مس میں اب آپ کو بدل کر دکھاؤں گی وعدہ" یہ کہہ کر اس نے اپنا بستہ اٹھایا اور وہ لائبریری سے ایک شاہانہ چال سے نکلی اور میری طرف مڑ کر دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی نہیں بلکہ ایک تشکر کی چمک تھی۔

میں نے سوچا یہ ہی میری کامیابی ہے کہ ایک بھکارن میری زبان کی تپش سے پگھل کر ایک شاہانہ چنگاری میں تبدیل ہو چکی ہے۔

ایک تحفہ

جمیلہ دیکھنے میں تھوڑی گول مٹول ضرور تھی لیکن بڑی پرکشش اور پروقار خاتون اور جاذب نظر دوسری طرف اس کے شوہر جمال بھی بڑے خوبصورت اور خوش مزاج ساتھ ساتھ شرافت کا پیکر دونوں اس زمانہ میں ہمارے گھر آیا کرتے تھے جب ہم نے اپنی ازدواجی زندگی کا آغاز ہی کیا تھا اور اکثر اس جوڑے سے ہماری ملاقات کسی نہ کسی تقریب میں ضرور ہو جاتی۔ دھیرے دھیرے ہماری آپس میں بے تکلفی بڑھتی چلی گئی۔ ان کے تین بچے تھے۔ وہ بھی اچھے خاصے خوش شکل وہ بھی اکثر ان کے ساتھ ہوتے۔ غرضیکہ یہ خاندان قابل رشک تھا۔ اپنی نجی زندگی بڑی آسودہ حالی میں اور پرسکون طریقے پر گزار رہے تھے اور لندن کے ایک خاموش علاقے میں ایک بے حد خوبصورت مکان کے مالک تھے۔ جہاں وہ کبھی کبھی موسیقی کی تقریب بھی کیا کرتے ہم کو بھی دعوت دیتے۔ کبھی وہ ہمارے گھر آتے۔

ایک دن صبح یہی کوئی 9-10 کا وقت ہوگا' فون کی گھنٹی بجی' جمیلہ کی بھابھی عطیہ بول رہی تھیں۔ "ہیلو عذرا" "بول رہی ہوں" میں نے جواب دیا' اس کی آواز میں گھبراہٹ تھی' غضب ہوگیا۔ جمال بھائی کا انتقال ہوگیا۔ "وہ کیسے؟" میں نے یکبارگی پوچھا۔ بس دفتر سے آئے اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گئے۔ شام کا جھٹ پٹا تھا جمیلہ نے عامر کو آواز دے کر کہا جاؤ بیٹے ابو کو بلا لو میز پر کھانا لگ گیا ہے۔ اس نے آواز دی' وہاں کوئی جواب نہ پا کر اس نے ہلایا تو اس کی تو جان نکل گئی' کمرہ سے چیخا' امی جلدی اوپر آیئے دیکھئے ابو کو کیا ہوگیا' جمیلہ نے آکر دیکھا اور فوراً" ڈاکٹر کو فون کیا۔ ڈاکٹر نے آکر دیکھا اور سر ہلا دیا اور سر جھکا کر نکل گیا اور وہی ہوا جو ہوتا ہے۔ یہ کہہ کر عطیہ نے فون بند کردیا۔ ہم لوگ فوراً" پہنچ گئے۔ جمیلہ کی رو رو کر آنکھیں سوج گئی تھیں' اس کے بچے یتیم ہوگئے لیکن اس کے دونوں تینوں بھائیوں نے سر پر ہاتھ رکھا اور پھر جمیلہ نے ایک فیکٹری میں ملازمت کرلی اور کفایت سے گزر کرنے لگی۔

ادھر میری زندگی اپنے شوہر اور بچوں میں مصروف ہوگئی پھر وقار کو مڈل ایسٹ میں ایک

اچھی پیشکش ہوگئی اور ہم لوگ وہاں چلے گئے۔ بس زندگی کی بے پناہ مصروفیت کی وجہ سے لندن والوں سے کوئی خاص رابطہ بھی نہ رہا جو جمیلہ کی بابت پتہ چلتا۔

پھر ہم لوگ جب سات سال کے بعد مڈل ایسٹ سے واپس آئے تو جمیلہ کا پتہ نہ چلا۔ ایک دن سی اینڈ اے میں مجھے جمیلہ نظر آئی' میں یکبارگی خوش ہوکر اس طرف دوڑی' جہاں وہ ہینگر پر لٹکی ہوئی ٹائیوں کو دیکھ رہی تھی۔ میں نے پیچھے سے اس کی آنکھیں بند کرلیں' اس نے ہاتھ چھو کر دو چار نام لئے پھر میرا چہرہ چھو کر دیکھا اس کے منہ سے عذرا نکل گیا اور ہم دونوں ایک دم لپٹ گئے' تم کب واپس آئیں؟ اس نے ایک دم سوال کرڈالا۔ ارے پچھلے مہینے۔ تم نے تو کبھی جا کر خط بھی نہ لکھا۔

"ارے چھوڑو خطوط کون پڑھتا ہے۔ اچھا کیسی ہو؟ پیچھے سے اس کی بیٹی نبیلہ آگئی۔ ارے عذرا آنٹی آپ کیسی ہیں۔ نبیلہ ایک خوبصورت قیامت لگ رہی تھی۔ اتنے عرصے کے بعد اس کو دیکھا یہ ہی کوئی اٹھارہ انیس کا سن ہوگا' پیچھے سے ایک بچہ کھیلتا ہوا آیا' اس نے آواز دی ممی مجھے گاڑی چاہئے۔ ارے مبارک ہو نبیلہ کی شادی کردی۔ "نانی بھی بن گئیں" میں نے عذرا سے کہا۔

"نہیں عذرا یہ تو میرا بیٹا نبیل ہے۔ نبیلہ تو ابھی یونیورسٹی میں داخل ہوئی ہے' اس کی شادی ابھی نہیں ہوئی ہے۔" میں ایک دم سناٹے میں آگئی۔ اپنے چہرے سے حیرت انگیز تاثر کو چھپاتے ہوئے میں نے پوچھا "شادی بھی کرلی' کس سے؟؟"

"گھر آنا پھر سب تفصیل بتاؤں گی پرسوں ضرور آنا رات کا کھانا ہم ساتھ کھائیں گے۔" پیچھے سے مجھے وقار نے آواز دی۔ عذرا چلو ارے یہ دیکھئے کس سے ملاقات ہوگئی۔ وقار نے بھی جمیلہ کو پہچان لیا۔ اچھا پرسوں وعدہ پکا ہاں ہاں ضرور آئیں گے' ہم لوگ باہر نکل آئے۔

حسب وعدہ ہم لوگ یعنی میں وقار اور ناصر تینوں جمیلہ کے بتائے ہوئے نئے پتے پر پہنچے۔ یہ فلیٹ ایک ایسے علاقے میں تھا' جہاں نسلی حملے اور ہنگامے اکثر ہوتے رہتے ہیں۔ ڈرتے ڈرتے ہم لوگوں نے کارپارک میں اپنی گاڑی کھڑی کی اور اس کے بتائے ہوئے پتہ پر پہنچ گئے۔ گردو نواح کی گندگی دیکھ کر کچھ طبیعت پر ملال سی تھی لیکن جب دروازہ کھلا تو اندر کچھ اور ہی رنگ تھا۔ گھر بے حد قیمتی قالین' پردوں اور فرنیچر سے آراستہ ہر چیز بے حد ماڈرن بچے کے کھیلنے کے لئے قیمتی کھلونے ایک طرف برآمدے میں پڑے ہوئے' فلیٹ سجا ہوا۔ جب اندر داخل ہوئے تو کمرہ میں ایک خوبرو نوجوان سے جمیلہ نے یہ کہہ کر تعارف کرایا عذرا

یہ فراز ہیں۔ لمبے تڑنگے پٹھان نما شخص کو دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا یہ چہرہ تو شناسا ہے مجھے محسوس ہوا۔

"میں نے اس سے پہلے آپ کو کہیں دیکھا ہے" میں نے ذہن پر زور ڈالنے کی کوشش کی!"ہاں کہاں" میں ابھی بھی اپنی یادداشت کو کھنگال رہی تھی۔

وہ مسکرائے آپ کو یاد نہیں آرہا سات آٹھ سال پہلے آپ سے پاکستان میں میری ملاقات آپ کی بہن ذکیہ کے گھر ہوئی تھی۔ جمیلہ نے میرے لئے ایک پارسل بھیجا تھا' وہ میں لینے آیا تھا۔ ان کے جواب میں میرا چہرہ کھل اٹھا' قدرے تیز آواز میں' میں نے کہا "ارے آپ ان کے خالہ زاد بھائی ہیں۔" "ہاں ہاں عذرا اب نہیں' اب یہ میرے مجازی خدا ہیں" میں ان باتوں سے گھبرا گئی۔ گھبراہٹ میں میرے منہ سے نکلا "ارے یہ تو شادی شدہ تھے۔" جمیلہ نے میری بدحواسی کو بھانپتے ہوئے کہا۔ "بیٹھو تو ابھی سب پتہ چل جائے گا۔"

وقار بھی بوکھلا گئے اور میری مشکل آسان کرتے ہوئے بولے' صبر کرو کوٹ اتارو ابھی جمیلہ سے کہانی سن لینا۔ جمیلہ چائے پلاؤ اور ہاں جناب تو فراز صاحب مجھے وقار کہتے ہیں' آیئے بیٹھیں' ان سہیلیوں کو آپس میں گپ مارنے دیں۔ جمیلہ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنے باورچی خانے میں لے گئی۔

"لو تو سنو قصہ یہ ہے کہ جمال کے انتقال کے بعد میں بہت اداس رہنے لگی تھی۔ بچے بھی جوان ہو رہے تھے۔ کمال سولہ کا نبیلہ 18 کی اور جمیل 20 کا ہوگیا' ان کی اپنی بیرونی دلچسپیاں بڑھنا شروع ہو گئیں' میں پھر اکیلی کی اکیلی بھائی سارے اپنے خانگی مسائل میں الجھے ہوئے' میں پاکستان چلی گئی' سوچا وہاں جاکر رہنے لگوں' وہاں میں نے ایک مکان گلبرگ میں خرید لیا۔ وہ جو ہمارا مکان تھا نہ اس کو بیچ کر اور تھوڑا پیسہ بچا تو اس کو وہاں بزنس میں لگا دیا لیکن دل تنہا کا تنہا۔ کبھی کبھی فراز میرے پاس شام کو آجاتے۔ بچوں کو وہاں میں نے بورڈنگ میں ڈال دیا۔ بڑا اور نبیلہ دونوں نے وہیں پڑھا اور کمال بھی میرے پاس سے چلا گیا۔ کبھی یہاں آتی تم کو معلوم ہے بہن تو میری کوئی ہے نہیں بس بھابھیاں۔ تو ایک پاکستانی دوسری سوئیڈش اور تیسری فرنچ بس ہلو ہلو تک معاملہ تھا۔ ادھر فراز نے مجھ میں دلچسپی لینی شروع کردی۔ تم کو تو معلوم ہے ہماری بچپن کی محبت تھی' وہ پھر عود کر آئی۔ اور ہم لوگوں نے پھر باقاعدگی سے باہر جانا شروع کردیا۔ "ان کی بیوی کہاں گئیں؟" میں نے بیچ میں لقمہ دیا۔ سن تو لڑکی انہوں نے اپنی بیوی سے کہنا شروع کیا کہ پارٹ ٹائم مل گیا پھر کہا کہ میں اگر باہر چلا جاؤں

تو کچھ پیسہ بن جائے گا' کوشش کررہا ہوں کہ جمیلہ کے ذریعے کچھ بزنس کرلوں ہے تو بیوہ مگر پیسے والی ہے۔ وہ پھر لندن آنے جانے لگے۔ یہاں مجھے ایک فلیٹ مل گیا اور یہ ہے بعد میں بچوں نے بھی کوئی اعتراض نہیں کیا۔ یہاں کے بچوں کی ذہنیت سے تم واقف ہو۔ اپنی پرائیویٹ زندگی پر سب کو اختیار ہے بس ہم دونوں بھی جذباتی ہونے لگے فراز کے وہی قسمیں اور وعدے بس پھر ہم دونوں نے چپکے سے یہاں نکاح کرلیا۔ اور دھیرے دھیرے پھر واپس یہاں میں ان کو لے آئی ہوں اور انہوں نے اپنی پہلی بیوی عشرت کو سمجھا دیا ہے' وہ وہاں رہتے ہیں۔ ایک لڑکا اور ایک لڑکی ہے۔ میں نے ان لوگوں کو حج بھی کرادیا ہے۔ باقاعدہ یہاں سے پیسہ جاتا ہے' یہ **گپلو** ہماری نشانی ہے۔ چلو کھانا کھاتے ہیں۔ ہم لوگ کھانے پر بیٹھ گئے اور جمیلہ کی رام کہانی سن کر میں گھر واپس آگئی مگر مجھے بڑی رات تک نہ جانے کیوں نیند نہیں آئی۔ وقار کو بھی مختصر قصہ سنا کر بات ختم کردی۔

پھر پتہ چلا کہ جمیلہ اور فراز پاکستان چلے گئے اور وہیں بس گئے۔ اب ان کی کوئی خبر ہمیں نہ ملتی۔ وہ شہر سے کیا ملک سے ہی چلے گئے تھے۔ میں بھی اپنے بچوں کی نگہداشت اور ملازمت میں ایسی مشغول ہوگئی' ایک دن میں نے ذاتی طور پر جمیلہ کو اس وقت دیکھا' جب وہ ہسپتال میں ایک بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی' جہاں برابر میں' میں اپنی دوست پالین کو دیکھنے گئی تھی۔ ستم ظریفی دیکھئے کہ وہ وہاں داخل تھی اور مجھے معلوم ہی نہیں بے حد پیلی کمزور اور اور لاغر بستر پر لیٹی تھی۔ میں ایک دم اس کے پاس گئی لپٹ گئی۔ "ہائے جمیلہ مجھے تو خبر کی ہوتی کیا حال بنا لیا اپنا کیسی ہو؟" اس نے مجھے دیکھ کر اپنا منہ دوسری طرف کرلیا۔ ارے کیوں مجھ سے خفا ہو۔ نہیں اس نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"میں تم سے نہیں اپنی قسمت سے خفا ہوں" اور یہ کہہ کر جمیلہ اٹھ کر بیٹھ گئی' کہنے لگی کہ میں آج کل بیمار ہوں' مجھ پر فالج کا اثر ہوگیا تھا' بس خدا نے خیر کی اب ٹھیک ہوں"

"فراز کہاں چلے گئے؟" میں نے بے چین ہوکر پوچھا۔

"وہ پاکستان میں اپنی پہلی بیوی کے پاس ہیں۔"

"ارے اور تم؟"

"ہاں میں بھی چلی گئی تھی لیکن میرا وہاں دل نہیں لگا۔"

"وہ وہاں تم یہاں یہ کیسی شادی" میں نے پوچھا۔

"وہاں میں نے ایک بیوٹی پارلر کھولا وہ چلنے بھی لگا تھا اور ہمارے پاس پیسہ خوب آنے

لگا' وہاں پر ایک مکان خرید ا اسے خوب سجایا یہاں سے سامان لے جا کر۔"

"پھر؟" میں نے بیچ میں ٹوکا۔

"بس فارغ البالی میں ہزار دو ہزار کما لیتی تھی اور مزے سے تھے لیکن قسمت....." وہ بولی۔

"جلدی بتاؤ یہ کیا حالت بنا رکھی ہے۔" میں نے پوچھا۔

"میں بزنس کے سلسلے میں یہاں آتی جاتی رہی۔ ایک مرتبہ مجھے تین چار ماہ ہو گئے" وہ بولی۔

"ہاں تو"

"بس وہ اپنی پہلی بیوی اور بچوں کو لے کر ہمارے گھر میں منتقل ہو گئے غالباً" اس سے پھر قریبی رابطہ ہو گیا۔"

"اور تم کو طلاق دے دی؟" (میری بے چینی اور تجسّس بڑھ رہا تھا) میں نے پوچھا۔

"نہیں"

"تو پھر"

"اور خط بھیجنا بھی بند کر دیا' میں نے فون کئے رابطہ کیا تو خط آیا کہ وہ سب ایک وقتی چیز تھی' میں سمجھا تھا کہ تم وہی پرانی جمیلہ ہو لیکن نہیں مجھے عشرت نے جو محبت دی' تم اس کا عشر عشیر بھی نہیں دے سکتی' تم مغرب کی باسی ماڈرن عورت ہو' میں لندن کی چمک دمک کے دھوکے میں تمہارے قریب آگیا اور جب بھی میں اکیلا ہوتا مجھے عشرت ثروت اور جاوید بہت یاد آتے اور میرا ضمیر مجھے جھنجھوڑتا' میں اب اور سزا اپنے آپ کو نہیں دے سکتا۔ مجھے معاف کر دو' میں فیل ہو گیا۔ تمہارا مکان بھی میں نے خالی کر دیا ہے' تمہارے پاس تمہارے پہلے شوہر سے بچے ہیں اور یہ **گبلو** جو ہماری تمہاری محبت کی نشانی ہے' اسے میری طرف سے ایک تحفہ سمجھ کر قبول کر لو۔ تمہارے پہلے شوہر نے تم کو مجھ سے چھینا تھا' وہ چوٹ تو میں نے برداشت کر لی تھی لیکن میں عشرت اور اپنے بچوں یعنی جاوید اور ثروت کا گھاؤ نہیں بھر سکوں گا ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔

"بس یہ ہوا میرے ساتھ عذرا" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

میں سوچتی رہ گئی۔ اے عورت تیرا نام کمزوری ہے۔

شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں

اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور سوچا کہ آج جینے سے دل کتنا بیزار ہے۔ گزری ہوئی رنگینیاں میری زندگی سے دور بہت دور جانکلی ہیں۔ میرے گھر کی چہار دیواری پر اداسی بال پھیلائے سسکیاں بھر رہی ہے اور دور سے جیسے کوئی تنہائی کی کھائیوں سے مجھے مبہم سا سایہ ابھرتا محسوس ہو رہا ہے کہ نوید تم پھر اکیلے رہ گئے' پھولوں کی خوشبو اڑ گئی' ایک اور عورت تم سے جدا ہو گئی۔ خدا بخشے اسے وہ بھی تمہارا ساتھ نہ دے سکی۔ یہ اتنا بڑا گھر' خوبصورت باغ' آم' نارنگیوں کے درخت' پھولوں سے بھری کیاریاں' رنگین پردے' رنگ برنگے قالین اور ایک تالاب جس میں مچھلیاں اور کنول تیر رہے ہیں۔ ایک شیورلیٹ گاڑی جو دودھ سے بھی زیادہ سفید تمہارے گیراج میں کھڑی ہے۔ خدا نے سب کچھ دیا لیکن تم پھر تنہا کے تنہا۔ وہ شریر آنکھیں ایک دم غائب ہو گئیں اور نوید اپنی اسٹڈی میں داخل ہوا' جہاں اس نے اپنا خوبصورت لائٹر اٹھایا اور سگریٹ جلا کر کش لیا۔ ریما بھی جا چکی ہے۔ اسے قبر میں سلاتے ہوئے سوچ رہا تھا' یہ دو سال ہی میں میرا ساتھ چھوڑ دے گی' میں نے سوچا بھی نہ تھا۔ گھر کا سناٹا اسے ڈس رہا تھا' دھیرے دھیرے گھر سے لوگ جا چکے تھے۔ کون کسی کے غم میں ہمیشہ ساتھ دیتا ہے' باجی کراچی جا چکی تھیں' بھابھی اور بھیا ملتان واپس چلے گئے۔ یار دوستوں نے بھی تسلیاں دے کر اپنی اپنی سواری پکڑی۔ وہ گھر تھا اور نوید تھا اس کو دوست یہ تجویز پیش کر کے چل دیئے کہ کوئی بیوہ عورت مل جائے تو نکاح کر لینا ورنہ یہ گھر تم کو کھا جائے گا۔ قسمت کے کھیل ہیں' جہاں اسے بوڑھی عورتوں کے جملے ہتھوڑے بن کر سر میں ضرب لگا رہے تنے اب نوید میاں ساٹھ سال کے ہو گئے ہیں' ان کو کہاں کوئی اپنی لڑکی دے گا۔ گھر دیکھو کتنا سندر ہے' خالہ اماں کہہ رہی تھیں لیکن کیسی نحوست برس رہی ہے۔ چچی جان کا جملہ سیسہ بن کر کانوں میں پگھل رہا تھا۔ اور جب سے یہ کمبخت گھر لیا ہے' ان کی زندگی میں بربادی آگئی' ہم نے تو بہت منع کیا تھا کہ میاں دوسری شادی نہ کرو مگر نوید میاں کب کسی کی

سنتے ہیں۔ وہ تو چنو باجی کے چکروں میں آ گئے اور ایک کم عمر لڑکی سے بیاہ رچا بیٹھے۔ ارم میں کیا برائی تھی، پڑھی لکھی سمجھدار تھی، بچے بھی خیر سے اللہ نے دیئے تھے، دو بیٹے دو بیٹیاں۔ یہ آوازیں ان کو اور کچوکے لگا رہی تھیں۔ نوید کوشش کر رہے تھے کہ اپنے کانوں کو بند کر لیں۔ یہ سب جا چکی تھیں مگر اپنی آوازیں یہاں دیواروں میں چن گئی ہیں۔

دل بہلانے کو انہوں نے ایک پرانا البم نکالا، جس میں ارم چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ بیٹھی ہیں، مقدس چہرہ، بس اپنی بدمزاجی اور پیسے کے نشے میں ایک دن غصہ میں طلاق طلاق کہہ بیٹھے۔ ارم تینوں بچوں کا ہاتھ، ہاتھ میں لے کر گھر سے نکل گئیں، نوید میاں بھی اپنی انا میں بیٹھے رہے۔ ارم تینوں بچوں کو لے کر میکے چل دیں اور انتظار کرتی رہی کہ نوید آ کر منا لیں گے لیکن وہ اپنی دولت کے نشے میں سب بھول گئے کہ آج جو کچھ شان و شوکت ہے، وہ ارم کی محنتوں اور قسمت سے ہے۔ مکان بھی اپنے نام بنوا کر بیٹھے تھے۔ ادھر محلے کی عورتوں کو موقع ملا چنو باجی نے آ کر کان بھر دیئے "ارے نوید میاں تمہارے اوپر ارم جیسی ہزاروں قربان، میاں دوسرا نکاح کر لو، وہ تو اب آئے گی نہیں، میری بھانجی ریما کیا بری ہے۔" نوید میاں کے منہ میں بھی پانی بھر آیا "کہاں ارم چار بچوں کی ماں اور کہاں ریما؟" عورت بھی کیا چیز ہے، جوان ہو تو رعنائی اور کشش کا پیکر ہوتی ہے، ہنس کر ٹال گئے۔ باجی چنو تو تھی ہی پکی سیانی باجی۔ سر پر دوپٹہ ڈال کر نکل گئیں اور کبھی کبھی آ کر کان میں یہ بات ڈال جاتیں "میری سنو تو نکاح کر لو" دھیرے دھیرے ان کا جادو سر چڑھ کر بولنے لگا اور ساتھ ریما کو بھی لانے لگیں۔ گھر کی آراستگی اور خوبصورت دیکھ کر ریما بھی سوچنے لگیں۔ عمر کے چالیس سال تو گزر ہی گئے ہیں بن سنور کر آنا شروع کر دیا، کبھی سالن بنا دیتی، کبھی پھلکے اور چنو باجی بھی ساتھ آ کر بیٹھ جاتیں "کیوں بھئی ارم کیسی ہیں، گھر ہی بیٹھی رہیں گی یا آپ ہی منانے جائیں گے۔ طلاق تو ہو ہی گئی اگر تین دفعہ کہہ دیا۔" نوید میاں ریما پر نظر ڈال کر کہتے "اب ہمیں اس عمر میں کون پوچھے گا۔" "لو میاں تم تو دیکھنے میں جوان لگتے ہو، بالوں میں خضاب لگا ہو تو چالیس سے زیادہ نہیں لگتے۔ ریما مسکرا کر سالن کی ڈش آگے بڑھاتی اور سر پر آنچل کھسکاتیں۔ یہ سلسلہ چلتا رہا اور ایک دن نوید میاں نے پیغام دے دیا اور پھر پوچھا لیکن چنو باجی یہ بتایئے کہ مہر کتنا ہو گا؟ "ارے میاں بس یہی کوئی چار لاکھ اور یہ مکان بھی اس کے نام لکھ دو تاکہ بعد میں کوئی جھگڑا نہ ہو۔" نوید میاں نے بھی کچی گولیاں تو نہیں کھیلی تھیں۔ آخری جملہ تو ٹال گئے۔ لو بھئی سادگی سے نکاح پڑھا دیا گیا اور طلاق کی رجسٹریشن ارم کے گھر والوں کو بھیج دی گئی۔

بچوں کے فون آتے تو ریما کہہ دیتیں وہ گھر پر نہیں ہیں۔ دھیرے دھیرے فون آنا بھی بند ہوگئے۔ ادھر شادی ہوتے ہی چنو باجی کا آنا کم ہوگیا۔ ریما کی فرمائشوں کا سلسلہ بڑھتا گیا اور ہنی مون مناکر جب واپس آئے تو پتہ چلا کہ ارم اپنے بچوں کو لے امریکہ چلی گئیں۔

نوید کا پیسہ یا تو ریما کے کپڑوں پر خرچ ہونے لگا یا گھر کی آرائش پر۔ ادھر پرانے دوستوں سے سلسلہ بھی ٹوٹ گیا۔ ریما سسرال والوں کو بھی خاطر میں نہ لاتیں تو ادھر سے بھی رابطہ نہ رہا۔ اگر کوئی رشتہ دار آنا بھی چاہتا تو ریما نوید سے کہتیں ہم کو آپس میں ذہنی ہم آہنگی کے لئے وقت چاہئے۔ گھر میں کسی چیز کی کمی نہ تھی' نوکر چاکر میاں نوید کو اندازہ ہی نہ ہوا کہ بیوی سگھڑ بھی ہے یا نہیں' وہ دھیرے دھیرے ان کے دل میں جگہ بنانے لگی اور اپنی محبت کے ڈورے ڈالتی رہی کیونکہ بچہ تو کوئی پیدا نہ ہوا۔ ان کے پاس وقت ہی وقت تھا سارا وقت میاں نوید کو ملنے لگا۔ اکیلا ان کو چھوڑتی نہ تھی' اسی طرح دو سال گزر گئے۔ ہر وقت بنی سنوری رہتی' آگے پیچھے نوید صاحب نوید صاحب۔ ہاتھوں میں مہندی لگی ہوئی اور دونوں ہاتھ چوڑیوں سے بھرے ہوئے انگلیوں میں چھلے۔ میاں کو بھی بنا سنوار کر یعنی چھیل چھبیلے۔ وہ بھی اپنے کو جوان سمجھنے لگے۔ کئی مرتبہ ریما نے یہ بات نوید میاں کے کان میں ڈالی کہ خدا نہ کرے آپ کو کچھ ہو لیکن یہ مکان بھی میرے نام ہو جانا چاہئے' ارم تو نہیں مگر بچے آکر میرے سر پر سوار ہو جائیں گے کہ نکلو اس گھر سے۔ نوید میاں یہ بات اس کان سے سن کر اس کان سے اڑا دیتے۔ "ارے چھوڑو وہاں امریکہ میں عیش کر رہے ہیں' یہ تو اونٹ کی داڑھ میں زیرہ ہے ان کے لئے۔ خود کبھی کبھی سوچتے ایسا نہ ہو کہ ریما بیگم مجھے نکال باہر کریں۔ بس سن کر ٹال دیتے۔ آج بہانے سے باتیں بنا کر پھر ریما نے موضوع نکالا۔ "اچھا بھئی کر دیں گے۔" ریما اپنے میکے گئی ہوئی تھیں۔ وہاں سے واپس آنے کے لئے فون کیا لیکن آج نوید میاں کا موڈ نہ بنا کہہ دیا کہ "ویگن سے آجاؤ یا ٹیکسی لے لو" ریما بیگم چل پڑیں اور ویگن میں بیٹھ گئیں۔ ٹریفک کے ہجوم سے بچنے کے لئے ویگن سڑک سے اتر گئی' کچے راستے میں ایک ٹرک ویگن سے ٹکرا گیا اور ریما بیگم اس حادثہ میں اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ بڑا ہی جانکاہ حادثہ تھا۔ یہ خبر نوید میاں کو سنائی گئی' وہ پہنچے اور لاش گھر پر لائی گئی۔ آج نوید کے سر پر ان کی موت ہتھوڑا بن کر لگی۔ ان کا رنگ اڑ گیا اور وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ ان کو کفنا دفنا دیا گیا۔ عورتوں کے رونے کی آوازیں آرہی ہیں۔ ایک آواز کہیں سے سنائی دی کہ آہ خالی نہیں جاتی کبھی کسی کی آہ نہ لے' یہ ارم کی آہ ہے۔ نوید سوچ رہے تھے یہ مکان عیش و عشرت

مجھے خوشیاں نہ دے سکا۔ آج یہ جملہ پگھلتا ہوا سیسہ بن کر دل پر لگا تھا لیکن اب کیا ہوگا، حلق سوکھ رہا تھا، کسی نے بیل دی تو ڈاکیہ ہاتھ میں ایک ٹیلی گرام لئے کھڑا تھا، جس میں لکھا تھا افسوس اللہ آپ کو صبر دے، ارم۔

دوسری طرف مالی نے کہا "مالک اجازت ہے یہ درخت کاٹ دوں، اس کی جڑیں نیچے تک پھیل گئی ہیں، یہ اس گھر کی بنیاد کو ہلا دیں گی۔" "ہاں ہاں کاٹ دو لیکن پہلے مجھے ایک گلاس پانی لا دو میرے حلق میں کانٹے پڑ رہے ہیں۔

مجھے پانی دو..... میری آواز.... ڈوب رہی ہے۔

پھانس

عام طور پر حسن اور فن بہت ہی کم ایک جگہ اکٹھا ہوتے ہیں لیکن ستارہ کی شخصیت میں دونوں ہی صفات اپنے اپنے عروج پر تھیں، ستارہ کی شاعری کا چرچہ ہر زبان پر تھا۔ اس کا دھیما دھیما اداس لہجہ جی میں ہجر کا دکھ ہر گھائل دل کو متاثر کئے بغیر نہ رہتا۔ اس کی شاعری میں دھرتی کی سچائی، دنیا کے ستم، محبوب سے ملنے کی تڑپ اور جذبہ ٔ عشق کی خلش غزل گوئی میں اپنے کمال پر پہنچ رہی تھی۔ اس کی جھنکار ملک کے گوشے گوشے میں سنی جا رہی تھی۔ بڑے والہانہ انداز سے اس کا پڑھنا، سب پر وجد چھا جاتا۔ اکثر مشاعرے میں سامعین کی آنکھ نمناک ہو جاتی۔ ریڈیو، ٹی وی اور اخبارات و رسائل میں انتظار ہوتا کہ اب کیا چیز آنے والی ہے۔ سنا یہ تھا کہ حسن اخلاق میں بھی وہ بہت قابل ستائش ہے لیکن ایک بات البتہ لوگوں کو گراں گزرتی کہ وہ کسی کو اپنا انٹرویو نہیں دیتی۔ وہ میرے محلے میں اپنی ماں کے ساتھ ایک فلیٹ میں رہا کرتی۔ میری بھی اس سے سلام دعا تھی۔ مجھے اس کی شخصیت میں اک خصوصیت یہ نظر آئی کہ اس کی آنکھیں بڑی پر کشش تھیں اور وہ مسکرا مسکرا کر بات کرتی۔ میں نے بڑی آنکھیں، چھوٹی آنکھیں، نیلی آنکھیں، سبز آنکھیں، اداس آنکھیں، نشیلی آنکھیں دیکھی تھیں لیکن ایسی مخمور آنکھیں زندگی میں کبھی نہیں دیکھی تھیں اور آگے کے بال گھونگھریالے تھے۔ اس کا رنگ گیہوں جیسا، بڑی ہی دلنواز شخصیت اور ایسی تنہا جیسے آسمان میں چاند، اس گلاب سے چہرہ کے نزدیک بات کو بہت دل چاہنے لگا اور شاعری سنو تو بے انتہا زخمی، اس پر ایسا کیا ستم ہو گیا جو یہ ایک برگ آوارہ کی طرح اندر سے زرد ہو گئی ہے۔ ایک دن مشاعرہ کی کسی نشست میں، میں نے اسے سنا اور تہیہ کر لیا کہ میں چارہ گر نہ سہی، شریک غم تو بن سکتی ہوں۔ میں نے اس کو خوب داد دی۔ مصرعہ بھی اٹھایا اور پھر قریب پہنچ کر کہا کہ آپ میرے گھر کے بہت قریب رہتی ہیں، میں آپ سے ملنا چاہتی ہوں۔ ہاں ہاں ضرور میں یہاں ایک اسکول میں پڑھاتی ہوں۔

آپ کی بھی زندگی مصروف ہوگی' آپ ضرور میری ٹوٹی دہلیز پر تشریف لے آئیں۔
دھیرے دھیرے میرے اور ستارہ کے مراسم بڑھ گئے' زہے نصیب کہ میری ایک بلند پائے کی شاعرہ سے دوستی ہوگئی۔ آپ کیا کرتی ہیں' اس نے ایک دن پوچھ ہی لیا۔ میں' میں تو ایک بینک میں کلرک ہوں اور میرا مشغلہ تصویریں بنانا ہے۔ کبھی آیئے تو میں آپ کو اپنی پینٹنگ دکھاؤں گی۔ میرے پاس کوئی ایسا فن نہیں ہے'بس وقت گزارنے کے لئے آڑی..... ترچھی تصویریں بنا لیتی ہوں۔ کاش آپ کی طرح میں بھی اپنے جذبات اور احساسات کی ترجمانی کر سکتی۔ نینا تم غم سے آشنا نہیں ہو اور تمہاری زندگی میں کوئی ایسی آندھیاں بھی نہیں آئی ہیں۔ تمہارے لئے ہی تمہارا شوہر ہے' میں تو اندھیرے میں رہتی ہوں لیکن آپ کی شاعری تو چاند ستاروں سے کم نہیں۔ نینا تم کو معلوم ہے کہ چاند پتھروں کی چٹان ہے' دور سے کتنا چمکتا ہے' میں اس لئے کسی کو اپنے قریب نہیں آنے دیتی ہوں اور اپنی محرومی کا احساس خود ہی کرنا چاہتی ہوں۔ میں اپنی ماں کے ساتھ رہتی ہوں۔ اس نے بیوہ ہو کر محنت مزدوری کر کے مجھے پالا ہے' میں اس کی اکلوتی بیٹی ہوں' میں اسے وہ نہ دے سکی جو ہر ماں چاہتی ہے۔ اچھا یہ بتاؤ کہ تمہارے میاں کیا کام کرتے ہیں' اس نے اچانک موضوع بدل دیا۔ میرے میاں تو ایئر لائن میں مینو آفیسر ہیں اور میری دو لڑکیاں' دو لڑکے ہیں۔ لڑکے میرے بھیا کے پاس دبئی میں رہتے ہیں اور ایک لڑکی کی شادی بھی ہوگئی ہے۔ وہ امریکہ چلی گئی ہے۔ بس میں میری بیٹی اور میرے شوہر یہاں رہتے ہیں۔

چلو خوش رہو' میں چائے پی کر واپس آگئی۔ ایک دن ستارہ کی نظم "بیداری احساس" ریڈیو پر سننے کے بعد وہ مجھے بہت یاد آئی۔ میں اس اشک و تبسم کی پر کیف کیفیت میں مبتلا ہوگئی کہ فوراً" اٹھ کر اس کے گھر ٹہلتی ٹہلتی چلی گئی۔ گھر پر ستارہ موجود نہیں تھی۔ ماں نے دروازہ کھولا خالہ جان ستارہ ہے؟ نہیں بیٹی تم اندر آجاؤ' وہ ابھی آتی ہی ہوگی' اس کا ریڈیو پر پروگرام تھا' ابھی تم نے شاید نظم بھی سنی۔ جی ہاں جی ہاں "بیداری احساس" اسی لئے تو آئی تھی کہ مجھے بہت اچھی لگی۔

خالہ جان مجھے بتایئے کہ ستارہ نے شاعری کب سے شروع کی' اس کی زبان میں سوز و گداز بہت ہے۔ یہ کسی کو انٹرویو بھی نہیں دیتی ہے۔ نینا! ستارہ تم سے بہت محبت کرتی ہے۔ وہ کم آمیز ہے۔ کم گو ہے' ایک شرط پر میں تم کو بتاؤں گی..... کہ تم اس کا ذکر کسی اور سے اور نہ ہی ستارہ سے کرنا' اس کی یادیں اس کے 20 سال کے ماضی پر محیط ہیں اور یہ صرف شاعری

کے ذریعہ اپنا غم ہلکا کرتی ہے۔ یہ اپنے جذبات اور احساسات کا اظہار مجھ سے بھی نہیں کرتی ہے۔ کبھی شاذ و نادر بھی اپنا ماضی نہیں دہراتی ہے۔ تم وعدہ کرو کہ یہ بات اس سے مخفی رکھو گی۔ خالہ جان وعدہ شاید میں ستارہ کا بوجھ کچھ سنبھال لوں۔ یہ کسی سے بے تکلف نہیں ہوتی ہے۔ یہ اندر سے بالکل ٹوٹی رہتی ہے اور اوپر سے جڑی نظر آتی ہے۔ یہاں آنے سے پہلے ہم لوگ فیض آباد کے قریب ایک چھوٹے سے قصبہ میں رہا کرتے تھے۔ کھیتی باڑی ہمارے آباء و اجداد کا پیشہ تھا۔ میرا ایک ہی لاڈلا بھائی تھا۔ وہ زمینوں کی دیکھ بھال کرتا، اس کا ایک بیٹا تھا، جس کا نام وسیم تھا۔ ستارہ اور وسیم کھلی ہوا میں کھیتوں میں کھیلا کرتے۔ میرا بھائی انہیں دیکھ کر کہتا، باجی دیکھو کتنی پیاری جوڑی ہے دونوں کی۔ درحاصل ستارہ ٹھیکری کی مانگ تھی، جب یہ پیدا ہوئی تھی تو اس نے اس کو وسیم کے لئے مجھ سے مانگ لیا تھا۔ یہ دونوں کھیلتے کھیلتے بڑے ہوگئے۔ ہمارے خاندان میں ویسے بھی لڑکیاں کم تھیں اس دوران ہندوستان میں آزادی کی فضا پھیل گئی اور مسلمانوں کی ایک نئی مملکت پاکستان وجود میں آئی۔ کم عمر نوجوان پاکستان کے خواب دیکھنے لگے۔ وسیم کے ذہن میں دھن سما گئی کہ پاکستان چلو۔ وسیم نے باپ سے اجازت لی اور پاکستان سدھارا اور کہا کہ جب روزگار لگ جائے گا تو والدین کو بھی بلا لے گا اور ستارہ کو بھی۔ ایک دن سنا کہ وسیم کے ماں باپ بھی چل دیئے اور بھائی نے مجھ سے کہا کہ باجی تم بھی ستارہ کو لے کر آجانا۔ شروع شروع میں تو خط آئے لیکن دھیرے دھیرے یہ خط و کتابت بند ہوگئی۔ ستارہ کے ابو کا ایک دن ہارٹ فیل سے انتقال ہوگیا، میں اور ستارہ اپنا گزارہ زمینوں سے جو پیسہ دھیلا ملتا اس سے کرتے رہے۔ ہم نے پاکستان کئی خط بھیجے، وہاں سے کوئی جواب نہیں ملا۔ ستارہ کے رشتے آنا شروع ہوگئے لیکن یہ لڑکی وسیم کا انتظار کرتی رہی۔ برادری والوں نے مجھے سمجھایا کہ تمہاری آنکھ بند ہوجائے گی۔ ایک رشتہ آیا، وہ لڑکا تو کیا 52 سال کا بوڑھا تھا۔ پتہ چلا کہ اس کے بیوی بچے باہر رہتے ہیں۔ وہ ہندوستان نہیں آنا چاہتے ہیں، یہ ایک پیٹرولیم کمپنی میں مینجر ہے۔ پیسہ ہے کوٹھی ہے، گاڑیاں ہیں۔ اس کے گھر والے بھی لکھنؤ کے تھے، بہن بھی پڑی لکھی تھی۔ سنا تھا کہ بیرون ہندوستان رہ کر آئے ہیں۔ یہ لوگ بہت ہی روشن خیال قسم کے لوگ ہیں اور وہ اپنی پہلی بیوی کو ایک لمحہ بھی اپنے ساتھ رکھنا گوارا نہیں کرتے ہیں۔ ادھر ستارہ بھی 35-36 کی ہو رہی تھی نہ جانے سماج کے دباؤ میں آکر حامی بھرلی کہ چلو یہ شخص ایک اعلیٰ عہدے پر فائز ہے وسیم تو اس کو بھول بھال گیا ہے۔ ان صاحب نے ستارہ کو کہیں دیکھ لیا تھا ہر طرف سے زور دلوایا اور میں نے ستارہ کی شادی

کردی۔ ابھی مشکل سے کوئی چھ سات ماہ ہی ہوئے ہوں گے کہ ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ میرے داماد جن کا نام اختر تھا' ایک دن آئے ہوئے تھے' ستارہ میرے پاس چائے بنانے آئی۔ انہوں نے دراز کھول کر دیکھا تو اس میں وسیم کی تصویر پڑی تھی اور کچھ خطوط وسیم کے جو پہلے ستارہ کے نام آئے تھے' اٹھا کر اپنی جیب میں رکھ لئے اور پھر گھر جا کر ستارہ سے پوچھا کہ یہ وسیم کون ہے۔ پروین نے بتایا کہ میرا ماموں زاد بھائی ہے۔ پوری کہانی معصومیت سے سنا دی۔ پوچھا کیا تم اسی سے محبت کرتی تھی۔ ستارہ نے کہا کہ وہ میرا منگیتر تھا۔ اختر نے ستارہ کے منہ پر ایک چانٹا مارا اور کہا مکار' آوارہ' بدمعاش یہ سب پہلے کیوں نہ بتایا۔ ستارہ بولی یہ ایسی بات نہیں تھی کیونکہ حالات بدل گئے۔ البتہ ستارہ نے کہا کہ آپ نے سوچا تو ہوتا کہ جس لڑکی کی عمر اب 35 سال کی ہو رہی ہے اور وہ اچھی خاصی شکل کی بھی ہے تو کوئی وجہ ہوگی۔ بس بھئی اس روز سے اختر کے رویہ میں بہت تبدیلی ہوگئی۔ وہ بات بات پر ہاتھ اٹھانے لگا۔ ستارہ نے مجھے یہ سب باتیں نہیں بتائیں اور اس کے کوئی اولاد بھی نہیں ہوئی۔ یہ اندر ہی اندر یہ ظلم و ستم سہتی رہی۔ اختر بلڈ پریشر کا مریض تھا اور اس کو گٹھیا کی بیماری تھی۔ ایک دن وہ بھی ہمبر کے ہٹنے سے چکرا کر گرا ناک سے خون آیا' ہسپتال لے جاتے لے جاتے راستہ میں دم توڑ دیا۔ البتہ ایک مکان اس نے مہر کی صورت میں ستارہ کو لکھ دیا تھا اور باقی جائیداد اختر کی پہلی بیوی نے قابو کرلی۔ اس کے بعد یہ اور بھی تنہا ہوگئی۔ مجھے اپنے ساتھ لے آئی۔ اس کے بعد اس کے بہت سے پیغام آئے لیکن یہ اب شادی کے لئے بالکل تیار نہیں ہے۔ وسیم کے جانے کے بعد بھی یہ لکھا کرتی تھی لیکن اختر کے ڈر سے کہیں پڑھتی نہیں تھی۔ اب یہ اس سے ہی دل بہلاتی ہے۔ خالہ جان وسیم کا کوئی پتہ چلا۔ ہاں بیٹی! سنا کہ..... کہ وہ پاکستان سے دبئی چلا گیا تھا اور پھر وہ ڈرگز کی تجارت میں پکڑا گیا۔ کیا یہ سب ستارہ کو معلوم ہے۔ ہاں بات کہاں چھپتی ہے۔ ایک دن بھائی جان کا بہت تفصیلی خط آیا تھا اور معافی مانگ رہے تھے۔ بیٹا وقت کے اوراق بھی نہیں پلٹتے ہیں۔ سنا ہے اسے 20 سال کی سزا ہوگئی ہے۔ بس یہ تھی ستارہ کی کہانی۔ وہ کسی کو انٹرو نہیں دیتی ہے۔ کہتی ہے اتنی گھناؤنی زندگی کا حال میں کیا بتاؤں' زمانہ بھر کو میرے غم جاناں سے کیا مطلب' البتہ اس کی کتاب آرہی ہے' جس کا نام اس نے ''پھانس'' رکھا ہے۔ بس نینا بیٹی یہی پھانس کی چبھن تو ہے' جس نے آج میری بیٹی کو ایک عالمی شاعرہ بنا دیا ہے۔

آواز

ہوم ورک کلب میں کوئی آئے یا نہ آئے آسیہ ضرور آتی' اس کا ابھی سن ہی کیا تھا' مشکل سے چودہ سال کی ہوگی لیکن' اس کی آنکھوں میں جیسے چودہ صدیوں کی کہانیاں دفن ہوں۔ میں تو جب بھی اس کو دیکھتی' دیکھتی رہ جاتی۔ یہ سانولی سلونی لڑکی نہ جس کی آنکھیں ہرن کی آنکھوں کی طرح تھیں نہ ہی اس کا رنگ سرخ گلاب کی طرح تھا نہ اس کی گردن بھی صراحی دار تھی حسن نام کی کوئی شے بھی اس کو چھو کر نہ گئی تھی اس کے معصوم چہرہ پر حوروں جیسا تقدس تھا اور آنکھوں میں ایسی اداسی جھلکتی تھی کہ اگر آسمان کے سارے بادل بھی برس پڑیں تو بھی وہ اس کی آنکھوں کی نمی کے آگے شرما جائیں۔

آج وہ حسب معمول اسکول کی لائبریری میں اپنی ہم جولیوں کے ساتھ بیٹھی میرا انتظار کر رہی تھی۔ یہ ہوم ورک کلب جمعرات کو ان بچوں کے لئے تھا جو گھر میں جگہ نہ ہونے کی وجہ سے لائبریری میں بیٹھ کر اپنا کام کرلیا کریں اور خاص طور سے والنٹری طور پر کوئی بھی ٹیچر وہاں ان کی مدد کردے۔ کبھی کبھی میری ڈیوٹی بھی ہوتی۔ صرف 4 یا 5 لڑکیاں اور تین چار لڑکے ہی عموماً" ہوتے۔ میں نے داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔ "صرف تم تین ہی لڑکیاں ہو آج؟" "صوفیہ گھر چلی گئی' اسے آج ہوم ورک نہیں ملا" زینب نے جواب دیا۔ "مس زلیخا آج اسکول نہیں آئی" فاطمہ بولی۔ "علی کو اپنی ماں کے ساتھ شاپنگ کرنے جانا ہے" آسیہ نے کہا "کیوں وہ اکیلی نہیں جاسکتی؟" "علی کی ماں کو انگریزی بولنا نہیں آتا" زینب نے لقمہ دیا۔ " اچھا بیٹھو اپنا اپنا کام نکالو" میں نے کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "مس یہ ہٹلر اتنا ظالم کیوں تھا مجھے ہسٹری کا پراجیکٹ کرنا ہے" فاطمہ نے اپنا فولڈر بستے سے نکالتے ہوئے سوال کیا۔ آسیہ بھی میرے برابر آکر بیٹھ گئی۔ "آج مجھے کوئی ہوم ورک نہیں کرنا ہے۔ میں تو یہ این فرینک کی ڈائری پڑھوں گی' آپ نے پڑھی ہے یہ؟" "ہاں میں نے پڑھی ہے بڑی اچھی کتاب ہے' ایک معصوم لڑکی نے لکھی ہے" جسے انگریزی بالکل نہیں آتی۔ اس نے فارسی میں کہا کہ

آسیہ امروز مسرور نیست بسیار غمگین است میں نے آسیہ کو دیکھا۔ اس نے زبردستی مسکرا کر کہا آپ کو فارسی آتی ہے۔

ہاں تھوڑی بہت شد بدھ ہے۔ ارے آپ کتنی زبانیں جانتی ہیں؟ آمنہ نے آپ سے کیا کہا۔ یہ کہہ رہی ہے تم آج غمگین ہو۔ آسیہ نے نظریں جھکالیں۔ میں پڑھوں گی نہیں ' میں آپ کے پاس بیٹھوں گی۔ میں نے آمنہ کو پڑھانا شروع کردیا اور فاطمہ سے کہا ہاں بھئی وہ تم ہٹلر کے بارے میں کیا پوچھ رہی تھیں۔ مس اس نے دوسری جنگ عظیم میں اتنی تباہی مچوادی بچوں کو اپنے ماں باپ کو چھوڑ کر کیمپوں میں جانا پڑا۔ کتنے لوگ مارے گئے' وہ اپنا ہوم ورک کرتی جارہی تھی اور میں بار بار آسیہ کو دیکھتی اس نے پوچھا کہ مس آپ کے کتنے بچے ہیں' آپ کے کوئی لڑکی بھی ہے۔ ہاں بھئی ہے تو ایک بیٹی ہے دو بیٹے ہیں۔ فاطمہ کہتی ہے وہ بے حد خوبصورت ہے۔ ہاں خدا ان کی قسمت اچھی کرے اور پڑھ لکھ جائیں شاید آسیہ نے میرے چہرہ پر مادرانہ شفقت کے تاثر کو پڑھ لیا' اس کی آنکھوں میں ایک بجلی سی کوندی کیا آپ اپنی بیٹی کو بہت چاہتی ہیں۔ ہاں ایک ہے نا میں نے دھیرے سے جواب دیا۔ ''وہ بھی آپ سے بہت محبت کرتی ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''معلوم نہیں ہاں کرتی ہوگی'' میں نے ٹالتے ہوئے کہا۔

''ہاں بھئی آمنہ اپنی کاپی دکھاؤ''

میں کام کررہی ہوں آپ آسیہ سے بات کیجئے یہ بہت غمگین ہے' اس نے فارسی میں اور انگریزی دونوں میں اپنا مفہوم ادا کرنے کی کوشش کی۔ آسیہ نے بہت ہی پیار بھری نظروں سے آمنہ کو دیکھا۔ کیا بات ہے آسیہ کیوں پریشان ہے پھر کسی لڑکے نے ستایا ہے۔

نہیں بس میں صومالیہ واپس جانا چاہتی ہوں مجھے یہاں بالکل اچھا نہیں لگتا' میں اس کو لائبریری کے الگ گوشہ میں لے گئی کیوں بھئی یہاں دل نہیں لگتا؟ مجھے اپنی ماں بہت یاد آتی ہے آپ کسی کو بتایئے گا نہیں۔ ''یہاں تم کس کے پاس رہتی ہو ؟'' یہاں میری خالہ ہے' مس میں نے کام ختم کرلیا ہے گھر جاسکتی ہوں؟ فاطمہ نے آکر کہا۔ ''ارے یہ تو چار بج گئے میری بیٹی انتظار کررہی ہوگی' اب تم لوگ گھر جاؤ'' میں نے دیوار پر کلاک کو دیکھ کر کہا۔

اچھا مس شکریہ آسیہ نے معصومانہ لہجہ میں کہا۔

''سنو کل تم بریک یا لنچ ٹائم میں میرے کمرے میں آجانا' میں تم سے کچھ بات کرنا چاہتی ہوں'' ہاں ہاں ضرور اس کی آنکھوں میں چمک آگئی۔

میں گھر لوٹی لیکن اس روز کسی کام میں دل نہیں لگا' وہ معصوم چہرہ آنکھوں میں ایسے لیا ہوا تھا جیسے کسی محبوب کا تصور ذہن سے جانے کا نام نہ لے۔ یہ بچی کتنے بھاری پہاڑوں کے نیچے دبی پڑی ہے' اس کے غم کیا ہیں' میں بانٹ سکتی ہوں؟ کہیں خالہ اس کو مارتی پیٹتی تو نہیں ہے؟ اسے غلاموں کی طرح تو نہیں رکھا ہوا ہے نہ جانے پیٹ بھر کر اسے کھانا بھی ملتا ہے کہ نہیں؟ سگی خالہ ہے یا یتیم بچی اٹھالائی ہے' اس کی خالہ! وہ شام بہت بھاری کٹی اور بار بار یہ جملہ کیا آپ اپنی بیٹی کو بہت چاہتی ہیں میرے سر پر ہتھوڑے لگا رہا تھا۔ اس لڑکی نے تو مجھے پگھلا دیا ہے۔ اس کا غم نہیں یہ میرا دکھ ہے۔ بڑی مشکل سے رات گزری اور نور کا تڑکا ہوا۔ جوں توں کر کے لنچ ٹائم آیا۔ میں اپنے کمرے میں بیٹھی کاپیاں دیکھ رہی تھی۔ دروازے پر دستک ہوئی اندر آجاؤ آسیہ! ہیلو مس حوروں جیسی معصومیت اس کے چہرے پر کھل رہی تھی۔ کیسی ہو' آسیہ؟ مس آج میں بہت بہت خوش ہوں کیوں؟ آپ نے مجھے بلایا ہے نا اس لئے میرا جی چاہتا ہے ہروقت آپ میرے ساتھ رہیں۔ اچھا پھر تم بور ہوجاؤ گی۔ میں نے میز پر سے کاغذ سمیٹتے ہوئے جواب دیا۔ آؤ ادھر بیٹھو صوفے پر چائے یا اورنج جوس کچھ پیؤ گی؟ نہیں میں نے بریک میں اپنا لنچ لے لیا آپ کے پاس آنا تھا۔ آپ بہت تھکی ہوئی لگ رہی ہیں۔ ''ہاں اسکول اور گھر پھر ذمہ داریاں'' آپ بالکل میری امی کی طرح بولتی ہیں' آپ کی آواز بالکل میری امی جیسی ہے وہی تاثرات' کمال ہے ''اچھا.....''

''اس لئے مجھے اپنی امی بہت یاد آتی ہیں'' اچھا آسیہ یہ بتاؤ کہ تم صومالیہ واپس کیوں جانا چاہتی ہوں؟ تمہاری امی کہاں ہیں؟ میری امی تو اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ پھر کیا کروگی وہاں جاکر؟ میں ان کی قبر پر فاتحہ پڑھوں گی' میں اس گھر میں رہوں گی' جہاں ہم لوگ رہتے تھے وہاں ان کی یادیں ہیں۔ میں وہاں لوٹ جانا چاہتی ہوں اپنے ماضی میں۔ میں غور سے آسیہ کی باتیں سن رہی تھی۔ اس نے ایک قہقہہ لگایا اور کہا اچھا آپ میری باتیں سن کر ایک کہانی بنالیں گی اور پھر اس کو اخبار یا رسالہ میں لکھیں گی تاکہ آپ مشہور ہوجائیں۔ میرے آنسو آپ کی شہرت کے دیئے کو جگمگائیں۔ نہیں آسیہ نہیں نہیں ایسا نہیں ہے۔ مجھے تمہاری فکر ہے' تم ہروقت سہمی سہمی اور اداس رہتی ہو۔ میں نہیں چاہتی کہ تم اور دکھوں کا شکار بنو۔ اگر تمہارا دل چاہے تو بتادو میری کہانی تو بہت دردناک ہے۔ مس اس کے لئے روشنائی نہیں خون کے آنسو چاہئیں۔ وہ لڑکی بول رہی تھی اور میں اپنے آپ کو اس طرح چھوٹا محسوس کررہی تھی' اس کا غم مجھے ہمالیہ سے بھی زیادہ سلسلہ وار اور عظیم لگا' آپ جغرافیہ پڑھاتی ہیں' آپ پچھلے

ہفتہ جب ہمیں آتش فشاں پہاڑوں کی قسمیں بتا رہی تھیں میرے دل میں اس وقت بہت بڑا لاوا پھوٹ رہا تھا اور میرا جی چاہتا تھا کہ آپ سے اٹھ کر کہوں کہ آپ یہ پتھروں اور چٹانوں کے لاوے کی باتیں بند کریں۔ انسانوں' یتیموں' بیواؤں اور معصوموں کے دلوں میں جو لاوا دنیا کے چپے چپے پر پھیل رہا ہے' اس کی باتیں کیجئے۔ اس کو روکئے لیکن میں پھر چکرا کر بیٹھ گئی' کاش آپ مغرب میں رہنے والے لوگ جان سکتے کہ ہم بچے اتنی کم عمری میں ان تجربات کا مزہ چکھ رہے ہیں اور بے مول بک رہے ہیں۔ ایک کیمپ سے دوسرے کیمپ میں بھوک سردی' لامکان' ماں باپ سے جدا بچے' وہ کلیاں جو شاخ سے بغیر کھلے ہی مرجھا جاتی ہیں۔ بس کرو میں نے آسیہ سے کہا۔ اتنی چھوٹی سی بچی' اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری' میں واپس جانا چاہتی ہوں' اس ملک میں جہاں کے درندوں نے میری ماں' میرا باپ' میرا معصوم انگوٹھا چوستا بھائی اور مناسب کچھ چھین لیا ہے۔

وہاں جا کر تم کیا کرو گی؟ کس کے پاس رہو گی۔

آپ پہلے میری بات تو سن لیں' یہ میرے جذبات بھڑک رہے ہیں' میرے ان شعلوں کو آپ نے ہوا دی ہے' اب سلگتے ہوئے شعلوں کی آنچ میں وہ کہانی تو جلتی ہوئی دیکھئے آپ کی بچی ہے۔ ایک کل آپ کو دیر ہوئی تھی ہوم ورک کلب میں تو آپ نے کہا کہ میری بچی آ گئی ہو گی مجھے جانا ہے۔

مجھے دیکھئے کہ میں کتنی بے بس ہوں' اس کی آنکھوں سے آنسو ایسے بہہ رہے تھے جیسے دریائے سندھ میں سیلاب آ گیا ہو' سارے بند ٹوٹ گئے۔

میں نے اسے گلے سے لگایا اور کہا تھوڑا آرام کر لو نہیں آج تو مجھے ایک ممتا نے پکارا ہے تو لیجئے سنئے۔

ہم صومالیہ کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں رہتے تھے' میرا باپ وہاں پیٹرول پمپ پر کام کرتا تھا۔ میری ماں میرے دو بھائی ایک دو سال کا اور ایک منا چھ مہینہ کا۔ ہم مزے سے رہا کرتے تھے' خانہ جنگی شروع ہو چکی تھی۔ اور ایک دن میری ماں چولہے پر ہمارے لئے Sanuuha-d پکا رہی تھی' گھر میں نمک ختم ہو گیا' اس نے مجھے آواز دی' میں اپنے بھیا کے ساتھ کھیل رہی تھی' ماں کی آواز پر فوراً" دوڑی "بیٹی ذرا گلی کے نکڑ کی دکان سے مجھے نمک کی ایک پڑیا لا دے' میں ننگے پیر ہی بھری دھوپ میں بھاگتی ہوئی چلی گئی۔ واپس آنے میں مجھے مشکل سے دس منٹ لگے ہوں گے' میں نے آ کر دیکھا منا دروازے کے پیچھے چھپا کھڑا ہے اور

ماں کی لاش خون میں لتھڑی پڑی ہے۔ چھوٹا بھیا پنگوڑے میں پڑا انگوٹھا چوس رہا ہے اور چولہے پر فرائی پین جل رہا تھا۔ ہنڈیا سے بھانپ نکل رہی تھی مجھے دیکھ کر منا ایک دم لپٹ گیا کہنے لگا ابھی ابھی ہمارے گھر فوجی داخل ہوئے اور ابا کو سوتے سے اٹھایا اور بندوق کی گولیاں ماں پر چھڑ چھڑ چلا دیں اور ابا کو گھسیٹ کر گاڑی میں ڈال کر لے گئے' میں ڈر کے مارے دروازے کے پیچھے چھپ گیا۔ یہ سب پانچ منٹ کے اندر ہو گیا۔ میں نے منا کی انگلی پکڑی بھیا کو گود میں اٹھایا اور چیختی چلاتی نکلی پڑوسیوں نے دروازے بند کر لئے چٹخنی لگائی ہوئی تھی' کوئی بھی باہر نہ نکلا۔ میں کبھی آگے بھاگتی تھی اور کبھی پیچھے۔

ماں کی لاش ابھی بھی تڑپ رہی تھی' اس کی آنکھیں باہر نکلی ہوئی تھی مجھ سے کہہ رہی تھیں آسیہ بچوں کا خیال رکھنا۔

تھوڑی دیر بعد ایک دروازہ کھلا' اس میں سے یوسف نکلا جو ہماری لائن سے دو تین گھر چھوڑ کر رہتا تھا' اس نے تفصیل بتائی۔ پھر دھیرے دھیرے پڑوسیوں کے دروازے کھلے اور باری باری عورتوں نے مجھے منے کو گلے سے لگایا اور کہا کہ بچی ہم کچھ نہ کر سکے تم دروازہ کھلا چھوڑ کر چلی گئی تھیں' ان کو گھسنے کا موقع مل گیا۔ میری ماں کو محلے والوں نے نہلایا دھلایا اور اس کو دفن کر دیا۔ یوسف جو خود بھی مجھ سے ایک سال بڑا ہو گا' مجھے تسلی دیتا رہا' پڑوس سے کھانا آجاتا' ابا کا کوئی پتہ نہ چلا کہاں لے گئے' وہ لوگ پکڑ کر چار' پانچ روز کے بعد ایک گاڑی آئی ہم تینوں کو ایک کیمپ میں لے جایا گیا۔ منا مجھ سے لے لیا گیا کہ اس کو نرسیں پالیں گی' تم خود ابھی چھوٹی ہو۔ وہاں ہمارے لئے لنگر سے کھانا آتا انگریزی پڑھائی جاتی' جس میں بولنا اور سمجھنا سکھایا جاتا۔

میں اور بھیا کچھ عرصہ ساتھ رہے لیکن ایک روز صبح کو بھیا میرے کمرے میں نہیں تھا' پوچھنے پر پتہ چلا کہ اس کو کسی دوسرے کیمپ میں شفٹ کر دیا گیا ہے روتی پیٹتی رہی' وہاں کے نگراں نے مجھے سمجھایا کہ اسے ایک محفوظ مقام پر رکھا گیا ہے' کچھ دنوں کے بعد تم سب پھر اکٹھے ہو جاؤ گے۔

چند روز بعد کچھ لوگ آئے اور ہم کو ایئرپورٹ لائے' اس میں بہت سی عورتیں اور لڑکیاں تھیں۔ وہاں پر ابا میرے پاس آئے کہنے لگے بیٹی تم اب انگلینڈ اپنی خالہ کے پاس جا رہی ہو ہم سب وہاں آجائیں گے۔ اور ہم ایک جہاز میں بیٹھ گئے۔ ابا کے ہاتھ دور سے مجھے الوداع کہہ رہے تھے۔ سفید سفید لوگ ہم کو یہاں لے آئے اور پھر ایئرپورٹ پر میری خالہ کے ہاتھ میں میرا ہاتھ دے دیا اور چند ہفتوں کے بعد اس اسکول میں داخل ہو گئی۔ یہاں بہت سے لڑکے لڑکیاں وہاں سے آچکے ہیں' ان سب کی اپنی ایک کہانی ہے۔ جب سے آپ کو دیکھا ہے' میں آپ کو سنتی ہوں' آپ کی آواز بالکل ویسی ہے صرف صورت و شکل میں فرق ہے۔

ہاں اگر مجھے تھوڑی سی بھی خوشی ملتی ہے تو وہ آپ کی آواز سے آپ مجھے اپنی آواز ٹیپ کر کے دے دیں۔

آسیہ بول رہی تھی اور میں بالکل سن بیٹھی تھی۔

آسیہ اگر تم چلی جاؤ گی تو میری آواز کیسے سنو گی۔ شاید اس کا آخری جملہ میں نے سنا ہی نہیں تھا۔ آسیہ نے کہا آپ کا ٹیپ بہت سنبھال کر رکھوں گی۔

ہاں آسیہ یہ بتاؤ کہ وہاں جا کر کیا کرو گی۔ میں وہاں جا کر اسی گھر میں رہوں گی۔ یوسف سے ملوں گی، اپنی ماں کی قبر پر فاتحہ پڑھوں گی، اس پر پھول ڈالوں گی پانی کا چھڑکاؤ قبر پر کروں گی، وہاں ایک درخت سایہ دار لگاؤں گی تاکہ میری ماں پر چھاؤں رہے۔ یوسف میرا انتظار کر رہا ہوگا۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ماں کی قبر پر روز جایا کرے گا۔

اچھا آسیہ تم ضرور جانا پڑھ لکھ لو۔ تعلیم حاصل کر لو اور مضبوط بن جاؤ پھر جا کر اپنے گھر والوں کا بدلہ لینا۔ ضرور ضرور تم اپنے بھیا کو اپنے سب لوگوں کو تلاش کر لینا اور جب تک یوسف، تمہارا بھیا، تمہارا منا بھی جوان اور مضبوط ہو جائے گا، جب تک یوسف میرا انتظار کر رہا ہوگا، میں نے اپنی ماں کو گواہ بنایا تھا قبر میں کہ میں یوسف کو ہمیشہ یاد رکھوں گی۔

"آپ نے کبھی محبت کی ہے کسی سے؟ اتنا بے باکانہ سوال سننے کی مجھے توقع نہ تھی، میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس نے مسکرا کر آنکھیں نیچی کر لیں۔"

"آسیہ محبت تو ایک پیارا رشتہ ہے جو انسانوں کو ایک مالا میں پرو دیتا ہے" کبھی کبھی یہ مالا ٹوٹ بھی تو جاتی ہے، مس! ہاں اگر اسے سنبھال کر نہ رکھیں تو۔

مس میں اپنے یوسف اپنی ماں اپنے بھیا اور اپنے منے اور اپنے باپ ان تمام موتیوں کو چننے ہی تو جانا چاہتی ہوں، جن کو ان ظالموں نے تسبیح کے دانوں کی طرح بکھیر دیا ہے۔ مجھے وہ مقدس موتی چن کر پھر مالا بنانی ہے۔

میری ماں کی لحد کی مٹی سوکھنے نہ پائے، اس کی قبر دب کر برابر نہ ہو، میں جانا چاہتی ہوں۔ "

اچھا آسیہ میری کلاس ہے۔ اب تمہاری بھی کلاس ہوگی نا" میں آج اپنے آپ کو بہت مضبوط محسوس کر رہی ہوں۔

میں نے اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھا۔ تم بہت بہادر ہو۔ ہمت سے کام لو۔ ایک دن ضرور جانا لیکن کچھ بن کر۔ تمہارے عزائم بہت بلند ہیں، تم ضرور وہ پالو گی، جس کی تم کو تلاش ہے۔

آپ کی آواز کے شعلہ کی روشنی میں شاید یہ زیست کی راہیں آسان ہو جائیں، وہ یہ کہتی ہوئی باہر نکل گئی اور میں رجسٹر اٹھا کر اپنی کلاس کی طرف چل دی۔

وہ کون تھی؟

ہماری دکان یوں کہنے کو تو ہائی روڈ پر ہے لیکن کچھ ایسے موڑ پر ہے کہ سامنے سڑک کے پار ایک گلی سی ہے جو اس تنگ راستہ کو کونسل فلیٹوں کی جانب لے جاتی ہے جس کے ایک طرف پارک ہے۔ دوسری طرف سامنے چھوٹی موٹی دکانیں ہیں اور ان کی پشت پر فلیٹ اور مکانات کی عمارات بنی ہوئی ہیں۔ یہ ویران ویران سا علاقہ اپنی خود ہی ایک اہمیت رکھتا ہے۔ جہاں کے رہائش پذیر ہمارے مستقل گاہک ہیں۔ اس دکان کو کھولے ہوئے ہم کو کوئی پندرہ یا سولہ سال گزر چکے ہیں اور ہم اپنی اس دکان پر چاکلیٹ' سویٹ' کرسپس کے علاوہ بھی چھوٹی موٹی ضروریات کی چیزیں رکھ لیتے ہیں لیکن ہماری دکان اخبارات اور سگریٹ وغیرہ کے کاروبار سے پہچانی جاتی ہے یوں تو ہماری شاہراہ پر چند اور بھی نیوز ایجنٹ ہیں مگر ہمارا رشتہ اپنے مستقل گاہکوں سے جانا پہچانا سا ہے' جس میں مقامی خریدار تو اپنے مسائل بھی ہمارے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔ ان خریداروں میں ملے جلے قسم کے لوگ ہیں۔

کاروبار کے ساتھ ساتھ سماجی رشتہ بھی استوار ہے۔ لیکن ایک ہستی جو چند سالوں سے ہماری دکان میں آتی رہی ہے۔ عمر تو اس کی ہوگی کوئی یہی چالیس پینتالیس کے قریب۔ موسم جیسا بھی ہو۔ بارش' سردی' گرمی وہ خاموشی سے دو چار اخبار اٹھا کر پہلے تو ان کا سرسری طور پر جائزہ لیتی ہے اور پھر دو تین اخبار کے پیسے خاموشی سے کاؤنٹر پر رکھ کر چل دیتی ہے۔ چہرہ پروقار گڈ مارننگ اور شکریہ کے علاوہ کوئی بات نہیں۔ لیکن جس دن وہ اخبار لینے نہ آئے اس کی کمی صبح صبح محسوس ہوتی اور پھر اچانک وہ جانا پہچانا چہرہ ہماری دکان پر آجاتا ہے اور ہم لوگ سمجھتے کہ غالباً" یہ کہیں گھومنے پھرنے یا پھر کسی بیماری کا شکار ہوگئی ہوگی۔ لیکن اس مرتبہ اس کی طویل غیر حاضری کا احساس ہم دونوں میاں بیوی کو ہوا۔ سیتا نے بھی محسوس کیا کہ وہ بالکل غائب ہے۔ شاید زیادہ ہی بیمار ہے یا لمبی چھٹی مل گئی۔ سامنے کی گلی سے وہ آیا کرتی اور پھر انہی راستوں پر گم ہو جایا کرتی۔ ہم کو تو معلوم ہی نہیں تھا کہ وہ کہاں قیام پذیر

ہے۔ سیتا جو میری بیوی ہے اس نے کہا کہ غالبا" گھر بیچ کر یا فلیٹ سے کہیں اور چلی گئی ہوگی لیکن ایک تجسّس سا تھا۔ ہم دونوں اتوار کو سہ پہر کو اپنی دکان بند کر کے بجائے گھر جانے کے سامنے کی گلی کی طرف نکل گئے کہ معلوم کریں کہ وہ خاتون کہاں چلی گئی۔ شاید محلے میں کسی سے کچھ پتہ نشان یا خبر مل جائے۔ ہم دونوں ٹہلتے ہوئے ادھر گئے برابر کے پارک میں کچھ بچے کھیل رہے تھے۔ سیتا نے ایک بچی کو اپنی طرف بلایا اور کہا کہ بیٹی ہم کو نام تو معلوم نہیں۔ یہاں ایک خاتون رہتی تھی اور وہ روز صبح سات بجے ہماری دکان پر آ کر اخبار لے جاتی تھیں۔ بچی نے کہا مجھے نہیں معلوم آپ کس کو پوچھ رہی ہیں۔ سیتا نے تفصیلی طور پر اس خاتون کے خدوخال اور چہرہ کے ساتھ کپڑے بھی بیان کئے۔ وہ لڑکی ایک دم بولی جی ہاں میں سمجھ گئی آپ کس کو پوچھ رہی ہیں۔ وہ ہماری آنٹی کے برابر والے فلیٹ میں رہتی تھی۔ نمبر بیالیس میں سامنے جائیے آپ کو نظر آجائے گا۔ ہم دونوں تیز تیز قدم بڑھاتے ہوئے پہنچ گئے پہلے سیتا نے اس بچی کی آنٹی کے دروازے کی گھنٹی بجائی بچی بھی ہمارے پیچھے پیچھے دوڑتی ہوئی آگئی۔ اس سے پیشتر کہ سیتا یا میں کچھ پوچھتے وہ لڑکی جو آٹھ یا دس سال کی ہوگی فورا" اس نے اپنی آنٹی سے سب کچھ کہہ دیا اور پھر سیتا نے کہا کہ وہ ہماری مستقل خریدار تھیں۔ اخبار لینے صبح صبح آتی تھیں۔ عرصہ سے پتہ نہیں کیا ہوا آئیں نہیں۔ کیا بیمار ہیں یا چھٹی پر چلی گئیں یا کہیں اور گھر تبدیل کر لیا ایسے بے شمار سوالات سیتا نے اس خاتون کی جھولی میں ڈال دیئے۔ وہ عورت جو پڑھی لکھی اور سمجھدار معلوم ہوتی تھی یوں گویا ہوئی آپ کو حیرت ہوگی کہ ہمارا بھی سلام دعا تک ہی ان سے رابطہ تھا لیکن ان کی پروقار چال اور رکا رکا سا محتاط رویہ سب کو اپنی طرف مائل کرتا لیکن وہ کسی سے زیادہ بات نہیں کرتی تھیں۔ سوائے مسکرا کر سلام ودعا کے یا شکریہ۔

لیکن آپ کو سن کر بہت افسوس ہوگا کہ ایک روز یہی سات یا ساڑھے سات بجے ان کی لاش ان کے گھر کے باہر ملی۔ ایک ہاتھ میں اخبار اور دوسرے ہاتھ میں گھر کی چابیاں تھیں۔ نہ جانے کون ظالم ان کا قتل کر کے چلا گیا۔ پولیس آئی۔ اس نے تفتیش کی ان کی لاش کو لے گئے ہم کو اس سے زیادہ نہیں معلوم۔

ارے یہ خبر اخبار میں بھی نہیں چھپی اتنا بڑا قتل ہو گیا۔ آپ اندر آجائیے ہم آپ کو جو بھی معلوم ہے بتا دیتے ہیں۔ میرا اور سیتا کا تجسّس بڑھتا جا رہا تھا۔ ہم دونوں بے دھڑک اندر چلے گئے وہاں ہر چیز بے حد سلیقے سے رکھی تھی۔ آپ چائے یا کافی کچھ پئیں گے؟ نہیں۔ بس

صبح صبح ایمبولینس کی آواز سے ہماری آنکھ کھلی لیکن پولیس اور ایمبولینس کچھ نہ کرسکی۔ پوچھ گچھ کی۔ صبح صبح کسی دفتر جانے والے آدمی نے دیکھا غالباً" فوراً" ایمرجنسی کو فون کیا ہوگا۔ پوچھ گچھ کی ہوگی۔ کیا وہ قاتل پکڑا گیا؟

سیتا نے مضطرب ہوکر پوچھا۔ جی نہیں۔ ہماری وہ پرانی گاہک تھی۔ نہ جانے اس میں کون سی کشش تھی کہ جس دن وہ نہ آئے ہم اس کو یاد کرتے تھے۔ کیا اس کی عزت پر حملہ کیا گیا تھا یا اس کو لوٹنے کی کوشش میں یہ حادثہ ہوا۔ یہ ایک پراسرار قتل ہے۔ جس کا مجھے ابھی تک کوئی علم نہیں ہے۔ اس نے کہا میں آپ کو اس سے زیادہ کچھ نہیں بتا سکتی۔ البتہ برابر میں اس گھر میں اس کا اپنا سگا بھائی رہتا ہے۔ آپ چاہیں تو مزید معلومات اس سے کرلیں۔ ہم لوگوں نے شکریہ ادا کیا اور نکلنے کے بعد سیتا نے ان کے مکان کی گھنٹی بجا دی یعنی اس کے بھائی کی وہاں سے ایک لمبا چوڑا ایشین جو یہی کوئی پچیس سال کی عمر کا ہوگا۔ باہر نکلا اس کی شکل اپنی مقتول بہن سے بہت ہی مشابہ تھی۔ ہم لوگوں نے کہا کہ اگر آپ برا نہ مانیں تو ہم آپ کی بہن کی بابت جاننا چاہتے ہیں وہ ہماری پرانی گاہک تھیں دو تین ماہ سے وہ نظر نہیں آئی ہیں۔ ہماری دکان سے اخبار خریدا کرتی تھیں۔ ہم ان کی خیریت پوچھنا چاہتے ہیں۔ جی ہاں وہ آپ کی دکان سے اخبار لیا کرتی تھی' وہ تو تین ماہ پہلے فوت ہوگئی۔ اس کے چہرہ پر ایک اداسی چھا گئی۔ جی ہاں ہم کو معلوم ہوا ہے کہ ان کا قتل ہوا ہے اور ہم یہی معلوم کرنے آئے ہیں۔ جی ہاں آپ کو صحیح خبر ملی ہے۔ یہ عقدہ ابھی تک کھلا نہیں ہے کسی نے ختم کردیا ہے بس بھائی صاحب میں اس سے زیادہ کچھ نہیں بتا سکتا ہوں۔ اور پھر اس نے ہم لوگوں سے چائے کو پوچھا نہیں ہم گھر جارہے تھے۔ بڑا افسوس ہوا۔ شکریہ اور ہم لوگ باہر آگئے ایک سال گزر گیا وہ بات آئی گئی ہوگئی۔

ایک کسٹمر ہماری دکان میں آیا کہنے لگا آپ نے سنا کہ یہاں ایک سال پہلے ایک قتل ہوا تھا آج وہ قاتل پکڑا گیا ہے۔ اچھا سیتا نے فوراً" ہی تجسّس کا اظہار کیا کس کا قتل ارے وہ ایک جرنلسٹ یہاں رہتی تھی نا وہ سامنے والے فلیٹ میں۔ اچھا اچھا پھر کیا ہوا میں تو ایک Detective ہوں اور اس پکڑنے والی ٹیم کا ممبر۔

کیا ہوا؟ ہوا یوں کہ وہ انٹرویو لیتی تھی اور اخبار کا ایک کالم لکھتی تھی۔ اس قاتل کی ماں کا انٹرویو اس نے لیا جس میں اس کو پتہ چلا کہ اس کا بیٹا اس کے ساتھ بہت ظلم کرتا ہے اور وہ اپنے انٹرویو میں یہ بھی بتا بیٹھی کہ میرا بیٹا سگا بیٹا جس کے ساتھ میں رہتی ہوں وہ میرے ساتھ

سوتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر کسی کو بتایا تو وہ مجھ کو مار ڈالے گا لیکن نہ جانے کیسے یہ بات اس کی ماں نے اس خاتون کو بتادی اور اس نے ہم لوگوں تک رپورٹ پہنچادی۔ ماں نے گھر پہنچ کر اسے بتادیا کہ ایک جرنلسٹ کو یہ بات معلوم ہوگئی ہے راتوں رات وہ اس جرنلسٹ کے گھر پہنچ گیا ور انتظار کرنے لگا کہ وہ صبح صبح کہاں جاتی ہے اور وہ اخبار خرید کر دکان سے واپس آرہی تھی کہ اس نے اس کا قتل کردیا اور بھاگ گیا۔ کوئی اس کو پکڑ نہ سکا۔ ہم نے کوشش کر ڈالی مگر پتہ نہیں چلا۔ ہم کو ایک ڈائری ملی، جس میں اس نے صرف دو جگہوں کا ذکر کیا تھا۔ وہ اسی رات کی ڈائری تھی کہ میں کل ملیحہ سے ملی اور اس نے مجھے اپنی دلدوز داستان سنائی ہے مگر مجھ سے قسم لی ہے کہ میں کسی کو نہ بتاؤں اور کل جب میں اخبار لے کر آؤں گی تو پھر سیدھی پولیس اسٹیشن جاؤں گی۔ قریبی اخبار والے سے یہ اخبار سالہا سال سے خرید رہی ہوں۔ آپ کو اس لئے بتارہے ہیں کہ اس کے بھائی نے ہم کو بتایا ہے کہ آپ بھی پوچھنے آئے تھے وہ قاتل پکڑا گیا ہے اس نے بتایا کہ اس کے ہاتھ میں اخبار گارڈین تھا جو وہ آپ سے لے کر غالباً" آرہی تھی اور وہ آپ کی دکان سے سگریٹ لے کر نکلا تھا اس کے پیچھے پیچھے گیا اور پھر اس نے عورت کو مار دیا۔

میں اور سیتا ششدر رہ گئے لیکن ہم کو پھر بھی یہ نہ معلوم ہوا کہ وہ عورت کون تھی فرشتہ یا...... کیونکہ اس قاتل نے صرف اس کو نہیں بلکہ نہ جانے کتنے معصوم بچوں کا قتل کردیا، جن کو وہ پیسہ جمع کرکے برطانیہ بلا کر ان کو اپنے پیروں پر کھڑا کررہی تھی۔ وہ ایک کا نہیں ہزاروں کا قاتل نکلا۔ وہ عمر قید کی سزا بھگت رہا ہے اور ایک دن آزاد ہوجائے گا لیکن وہ جوان بچے جو اپنے ملک میں قید ہیں اور انتظار کررہے تھے کہ وہ عورت ان کو ستم سے آزاد کرا دے گی۔ ان کو اس قید سے آزادی کیسے ملے گی وہ کون تھی کیا تھی وہ تو ہمدردیوں کا مجسمہ تھی، جس کی اپنی زندگی ملک کے نونہالوں کو ظلم و تشدد سے بچاؤ کا ایک راستہ تھی جس راستہ کو قاتل نے کاٹ دیا میں اور سیتا ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہے تھے۔ ایک اور لڑکی نے کہا کہ یہ چپس اور سوئٹس کے پیسے ہیں۔ ہم نے منہ اٹھا کر دیکھا تو وہ لڑکی وہی تھی، جس نے ہم کو وہ گھر دکھایا تھا، جہاں اس کی آنٹی رہتی تھی۔ ان کے پیسے رہنے دو سیتا نے کہا یہ تم آج مفت ہی لے جاؤ وہ لڑکی شکریہ کہتی ہوئی ہنستی ہوئی بھاگ گئی۔

پس بہار

وہ سوتے سوتے چونک پڑا۔ اس کی ہڑبڑاہٹ سے نزہت کی بھی آنکھ کھل گئی۔ وہ آنکھیں ملتی ہوئی بستر سے اٹھی اور لائٹ آن کرتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا ہوا کوئی کیڑا وغیرہ ہے اس قدر ہانپ کیوں رہے ہیں آپ؟''

نزہت نے قریب آکر پوچھا۔

''تم میرے اور قریب آجاؤ۔ تم میرے ہی پاس ہونا ہاں تمہیں چھو کر دیکھ لوں۔'' وہ بوکھلا سا رہا تھا۔

''ارے اس میں کیا شک ہے' اس وقت میرے علاوہ یہاں اور کون ہو سکتا ہے۔ آپ کے اٹھنے سے میرا پلنگ ہلا تو دیکھا آپ اٹھے بیٹھے ہیں۔ کیا ہوا یہ کیسی بدحواسی ہے۔''

نزہت میں نے بڑا عجیب سا خواب دیکھا۔ ابھی دیکھا کہ میں اور تم سینما گئے ہیں' ہال میں سے نکلتے میں تمہارا ہاتھ میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور کسی دوسرے نے پکڑ لیا اور تمہیں خبر بھی نہیں۔ تم اس کے ساتھ چلی جا رہی ہو۔ میں پکارنے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن حلق سے آواز نہیں نکل رہی۔ یہاں تک کہ وہ اور تم میری نظروں کے سامنے سے تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے اوجھل ہو گئے۔ مجبور ہو کر میں نے دوڑنا شروع کیا لیکن اس بھیڑ میں تم نہ جانے کہاں غائب ہو گئیں۔ میں ہجوم کو چیرتا پھاڑتا تیز تیز دوڑا مگر تم دور جا چکی تھیں۔ تم نے پلٹ کر بھی نہ دیکھا۔ میں لاچار ہو کر بیٹھ گیا۔ بڑی عجیب حالت ہو رہی تھی مگر آواز ایسا معلوم ہوتا تھا بیٹھی جا رہی تھی۔ اتنے میں آنکھ کھل گئی ہڑبڑا کر اٹھا۔ تمہارا بستر دیکھا تو جان میں جان آئی۔ مجھے ایسا لگتا ہے تم کو مجھ سے کوئی چھین نہ لے۔ نہ جانے کیوں ایسے خواب اکثر دیکھتا ہوں۔ وہ بری طرح ہانپ رہا تھا۔

آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے ہیں بھلا اس میں کوئی آسکتا ہے۔

نزہت نے قہقہہ لگایا۔ ارے واہ رات آپ کہہ رہے تھے کہ میرے پیٹ میں درد ہے۔ بس معدہ خراب ہے۔ اس لئے ایسے بے تکے خواب نظر آتے ہیں۔ کروٹ بدل کر سوجایئے۔ صبح اٹھائیس جنوری ہے آپ کی سالگرہ کا دن ہے۔ سویرے ہی اٹھنا ہے، مجھے نوکروں کو ہدایت دینی ہے۔ یہ کہتے ہوئے اس نے لائٹ آف کردی۔

"اور ہاں سنئے آپ کے کتنے دوست آرہے ہیں۔ جتنی ہم لوگوں نے فہرست بنائی ہے نا؟" اس نے موضوع بدلنے کے لئے یہ بات کی۔

"ہاں شاید" اس نے بے اعتنائی سے جواب دیا۔ اور بستر پر اس طرح اوندھا لیٹ گیا جیسے وہ اپنا منہ چھپا کر رونا چاہتا ہے۔

نزہت لیٹے لیٹے اس کی طرف اندھیرے میں ہی دیکھتی رہی اور کچھ سوچتے سوچتے سوگئی۔

صبح اٹھتے ہی نزہت نے ہر نوکر کو بلا کر ہدایت دینا شروع کی۔ تمہیں کمرے صاف کرنا ہیں اور ہاں اتنا گوشت آنا ہے۔ ابھی منگوا لوں ورنہ پھر خراب ملے گا۔ اپنے شوہر کی طرف مخاطب ہوئی جو دفتر جانے کے لئے تیار ہونے میں مصروف تھا۔

نزہت سودا بتا کر اس کے پاس آئی۔ بولی آج دفتر سے جلدی ہی اٹھ آیئے گا۔ مٹھائی تو آپ کو لانا ہے۔ یہ لوگ تو پیسہ پھینک آتے ہیں اور ہاں تھوڑے بہت ہار بھی منگانے ہیں حنیف کو ساتھ لے لیجئے گا۔

"ہاں ہاں یہ چیزیں تو مجھی کو لانی ہیں۔" یہ کہتا ہوا وہ دروازہ سے نکل گیا۔

گھر سے دو قدم ہی نکلا ہوگا کہ ایک دم اسے کچھ خیال آیا الٹے قدم لوٹا۔ نزہت دوڑتی ہوئی آئی۔ "کیا ہوا چشمہ بھول گئے وہ تو جیب میں ہے فونٹن پین رہ گیا؟"

"نہیں یہ رہا" اس نے دکھاتے ہوئے کہا۔

"بلکہ......" نزہت نے بات کاٹ دی۔

"اچھا تو کھانے کو منع کرنے آئے ہیں۔"

"نہیں بھئی مجھے دیر ہو رہی ہے تمہیں اس وقت مذاق سوجھ رہا ہے۔"

وہ بھنا گیا۔

"ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ اماں سے کس وقت آنے کو کہلوایا ہے۔

صبح سے آجانے کو نا! سب ہی اکٹھا آجائیں گھر والوں کو مہمانوں سے پہلے گھر پر موجود ہونا

چاہئے۔

"کیا معلوم حنیف سے کہلوا تو دیا تھا بس ہاں ہاں کردیا وہاں تو ڈھنگ سے کسی نے بات ہی نہیں سنی۔ فرحاں صاحبہ بول پڑیں۔ ہمیں کیا بتارہے ہو معلوم ہے۔ اٹھائیس جنوری کو بھائی صاحب کی سالگرہ ہوتی ہے۔ وہ غریب بھی عاجز آجاتا ہے۔ اتنے لوگوں میں کوئی کان پڑی آواز بھی سنائی دیتی ہے۔" نزہت نے منہ سکیڑتے ہوئے جواب دیا۔

"اچھا اب میں تو چلا کافی دیر ہوگئی ہے دفتر کو کسی نوکر کو چھٹی ملے تو بلوا لینا۔ شاید گھر پر کوئی لانے والا نہیں ہے ورنہ وہ لوگ آجاتے اب تک۔"

"ایسی کیا گھبراہٹ ہے آجائیں گے اماں کو گرہ ہی تو لگانی ہے بس۔

شام کو لگے گی گرہ تو اب آپ جایئے اور ہاں سنیئے جلدی آیئے گا۔ بھولیئے گا نہیں۔"

وہ تیز تیز زینے سے اترتا چلا گیا۔

نزہت گھر کے انتظامات میں لگی تھیں۔ ایک آدھ نوکر پر گرج بھی پڑتی۔ کل ہی کہہ دیا تھا کمبخت سے کہ ذرا آکر پوچھ جانا اردلی سے۔ اگر اس وقت ہوتا تو کچھ سہارا ہی لگتا۔ تہواری مانگنے تو آجاتا ہے۔ نزہت بڑبڑا رہی تھی کہ باہر کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔

"حنیف ذرا دیکھنا شاید طلعت ہوگی میں نے کہہ دیا کہ ذرا ہاتھ بٹا جایئے گا میں اکیلی ہوں کہنے کو تو اتنی بڑی بڑی نندیں ہیں بھلا وہ کیوں آنے لگیں۔ اگر بھائی کا ذرا بھی خیال ہوتا تو ایک دن پیشتر آجاتیں۔ میرے کہلوانے کی بھی ضرورت نہ پڑتی۔ جب بلاؤ تب تشریف لاتی ہیں۔ شادی کے بعد پتہ نہیں کتنے نخرے ہوں گے ان لوگوں کے۔"

اتنے میں ایک آواز آئی (جو قریب ہوتی جارہی تھی)

"دلہن! دلہن! بچی کہاں ہو؟ کیا کروں تم تو جانتی ہو اپنے ابا کو ان کا دفتر جانا بھی بس چچا چھکن سے کم نہیں۔ لاکھ کہا۔ آج خالد کی سالگرہ ہے۔ مجھے چلا جانے دو ابھی سے غریب تھک جائے گی اپنی جان پر لگا بھی تو لیتی ہے اتنے لوازمات مگر بچی وہ کہاں ماننے والے۔ اب خدا خدا کرکے گھر سے نکلے تو میں نے محلّہ سے ضمیر کو ڈھونڈوا کر تانگہ منگوایا۔ اتفاق سے وہ آج اسکول نہیں گیا۔ یہ کہو کہ بیچارہ ضمیر کام آگیا۔ ورنہ میں بیٹھی رہتی۔ جب تم کسی کو بھیجتیں تب کہیں آنا ہوتا۔

شاداں اور فرحاں اسکول سے یہیں آجائیں گی ان سے کہہ دیا ہے۔"

"آج اسکول نہ جاتیں، امتحان تو تھا نہیں۔" نزہت نے بھنویں سکیڑ کر کہا۔

"بھلا شاداں کہاں ماننے والی ہے۔ اس کو تو موت بھی آئے گی تو کہہ دے گی انتظار کرو اسکول ہو آؤں۔"

"وہ یہی کہہ رہے تھے سب کو صبح سے بلا لو۔ میں تو جانتی ہوں نا مگران کو چین نہیں آتا آپ لوگوں کے بغیر میں بس اب حنیف کو بھیجنے ہی والی تھی۔" "اچھا تو بیٹا لاؤ مجھے یہیں کاٹنے کترنے کی چیزیں دے دو۔" پیار بھرے لہجہ میں کہا۔

"ماں باورچی خانہ میں چلی جایئے سب ہی کچھ تو ہونا ہے۔ وہ لوگ آجاتیں تو ہاتھ بٹ جاتا۔ اچھا میں ذرا ڈرائنگ روم دیکھ لوں گھر سے بھی ابھی تک کوئی نہیں آیا۔ بیچاری طلعت کو تو اپنے بچوں کی تیاری میں گھنٹوں لگ جاتے ہیں۔ فرحت گھر کے کام سے فارغ ہو گی تب کہیں دونوں مل کر آئیں گی اچھا میں ذرا باورچی خانہ میں ہوں آپ یہ کھوپرا کاٹئے...... دن بس یونہی گزر جاتا ہے۔ سردیوں کے دن ہیں" اور وہ یہ کہتی ہوئی دوسرے کاموں میں مصروف ہو گئی۔

خالد کے ساتھ ہی پیچھے پیچھے شاداں و فرحاں کتابیں لئے ہانپتی ہوئی زینہ پر سے چڑھ کر آئیں۔ "بھائی صاحب ہمارے ہی ساتھ ساتھ آرہے تھے ہم کو پتہ ہی نہیں فرحاں نے تعجب سے کہا۔

"میں نے تو جان کر نہیں دیکھا۔ چاپ سے سمجھ گئی تھی۔" شاداں نے اکڑ دکھائی۔

"اجی ہاں آپ کو تو الہام ہوتا ہے اپنے آگے پیچھے بس کتابیں رکھیئے کھانا کھایئے اور وہی بڑے تو آپ ہی کے ذمہ ہیں۔"

"فرحان آؤ ذرا ہم دونوں کیرم کھیلیں پھر تم مرچیں تلنا سب آتے ہی ہوں گے۔" خالد نے کوٹ اتارتے ہوئے کہا۔

"ارے بس آپ کو اس وقت کھیل کی سوجھی ہے سودا بھی لانا ہے بازار سے۔ ذرا آرام کر لیجئے۔ چائے وغیرہ پی کر چلے جایئے گا۔ دیکھئے آپ ہر وقت کھیلتے ہیں۔ فرحاں بھی اکثر ہی آتی ہے۔" نزہت نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔

خالد بسور دیا لیکن بیوی کی نظروں سے مرعوب ہو گیا اور فرحاں سے کہا۔ "جاؤ بیٹا جا کر کھاؤ پھر کبھی سہی۔"

خدا خدا کر کے سالگرہ کی تیاریاں ختم ہوئیں۔ مہمان آئے اور چلے گئے...... اور...... خالد کے روکنے کے باوجود اماں اور بہنیں گھر چلی گئیں۔ آج کے انتظامات سے نزہت

بہت تھک گئی تھی۔ مگر جب مہمان واپس چلے جاتے تو اس کی تھکن اتر جاتی چونکہ وہ سمجھتی تھی کہ اس کی محنت ٹھکانے لگی۔ آج ہی نہیں بلکہ ہر سال جنوری کی اٹھائیس تاریخ اس کے لئے پیغام مسرت لے کر آتی نہ صرف اٹھائیس ہی کو بلکہ سال کے اور دنوں میں بھی نزہت اپنے شوہر کے لئے طرح طرح کے کھانے تیار کرتی۔

وہ جانتی تھی کہ اس کے شوہر کو کھانے کا بہت شوق ہے' لٰہذا وہ روزانہ نئی چیز پکانے کی کوشش کرتی۔ خاص طور سے مٹر پلاؤ جو اس کی پسندیدہ چیز تھی وہ اکثر پکاتی مگر اس دن وہ بری طرح جھلا جاتی جب بھی کوئی مزے کی چیز پکی کوئی نہ کوئی مہمان دوست یا عزیز آٹپکتا لیکن خالد اتنا ہی خوش ہوتا وہ طبیعتاً" فیاض تھا اور اس کا خیال تھا کہ اس طرح لوگوں پر اچھا اثر پڑتا ہے۔ نزہت کے موڈ سے وہ سب کچھ سمجھ لیتا تھا لیکن بعد میں اسے سمجھا دیتا ارے واہ یہ کتنی اچھی بات ہے لوگ کہتے ہوں گے کہ جب بھی ان کے گھر جاؤ عمدہ عمدہ کھانے میز پر آتے ہیں۔ بہت ٹھاٹ سے رہتے ہیں یہ لوگ۔

ایک دن خالد دفتر سے جلدی چلا آیا نزہت گہری نیند سو رہی تھی۔ اس نے منہ پر پانی کے چھینٹے دیئے۔ نزہت نے آنکھیں کھولیں۔ "ارے آج اتنی جلدی کیسے" خوش ہوتے ہوئے کہا۔

"آج کوئی کام ہی نہیں سب کام جلدی ختم ہو گیا۔ میں نے سوچا چلو گھر چلیں تفریح ہی سہی ابھی اتوار کو کافی دن ہیں۔"

"ہاں ہاں یہ بات ٹھیک ہے لیکن کہاں کا پروگرام یہ بھی سوچا؟" نزہت نے بالوں کو پیچھے کرتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے پکچر چلیں کیا رائے ہے؟" اس نے ہلکی سی چپت پیار سے لگاتے ہوئے کہا۔

تو بس جلدی سے کپڑے بدل کر تیار ہو جاؤ' لانا آج کا ڈان کون سی فلم اچھی ہے؟

"ضدی' انداز' ترانہ' انہونی ارے اس میں ایک ہی ہے جو ہم لوگوں نے نہیں دیکھی ---ضدی!"

"ہاں ضدی کی بڑی تعریف سنی ہے۔"

"کس سے"

"طلعت عفت کر رہی تھیں' کہہ رہی تھیں دولہا بھائی کے ساتھ آپ بھی دیکھ آیئے

بڑی اچھی پکچر ہے۔ میں نے ٹال دیا کہ جب فرصت ہوگی دیکھا جائے گا۔"

"اچھا تو اٹھو ہاں بس جلدی مجھے ذرا شاپنگ بھی کرنی ہے۔"

"کیوں ارے ابھی اسی دن تو اتنی چیزیں خریدیں اب کیا لینا ہے۔"

"بھئی آج دفتر میں ایک صاحب بتا رہے تھے بڑا اچھا سوٹ کا کپڑا ہے۔ ایک دکان پر میں نے لیا ہے۔ تمہیں بہت پسند آئے گا تھوڑا ہے جلدی خرید لو..... چلو اگر اچھا ہوا تو ایک سوٹ ہی سہی۔" اس نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہاں ٹھیک ہے آپ کے سارے سوٹ بھی پرانے ہو گئے ہیں' اس دن میں نے کہا تھا تو آپ نے کوئی توجہ ہی نہ دی۔"

نزہت نے ہلکے سنہری رنگ کی ساری باندھی جو اس پر کھل رہی تھی گندمی چہرہ دبلا پتلا نازک سا جسم کافی جچ رہا تھا۔

"یہ کب بنائی بہت اچھا رنگ ہے تمہارے چہرے سے میچ کر رہا ہے۔"

دونوں ہنستے ہوئے باہر نکلے۔ بندر روڈ پر بس سے اترے۔ خالد نے جیب سے پتہ نکال کر ادھر ادھر نظریں دوڑائیں - شاید وہ دکان کو تلاش کر رہا تھا۔ نزہت بار بار اپنی ساری ٹھیک کر رہی تھی مگر اس کے چہرے کے اتار سے معلوم ہو رہا تھا کہ خالد کی شاپنگ اس کو ناگوار گزر رہی ہے۔

خالد ایک دم خوشی سے چیخا ارے وہ وہ دیکھو باٹا کے پیچھے ہاں کہاں وہ ہم لوگ کتنی دور آگے نکل آئے ہے نا وہ بورڈ۔

"رکشہ کر لیجئے میں تو تھک گئی۔" نزہت نے **کسمساتے** ہوئے کہا۔

"ارے واہ پھر پکچر کیسے دیکھو گی۔" اور دونوں رکشہ میں سوار ہو گئے۔

"خالد نے کپڑا دیکھتے ہوئے کہا دیکھو نزہی کیسا ہے"

"ارے یہ تو بڑا پیارا رنگ ہے اتفاق سے دونوں کو ہی پسند ہے یہ رنگ۔" نزہت دلچسپی لینے لگتی ہے۔

"قیمت بھی کوئی زیادہ نہیں' یہ بتاؤ کہ لگ کیسا رہا ہے۔"

"کتنی بار کہوں بہت اچھا ہے ضرور خرید لیجئے پھر آپ کو دیکھ کر اور لوگوں کا دل چاہے گا۔" خالد نے پورے ایک سوٹ کا ٹکڑا لے کر اس کو قیمت ادا کر دی اور اس کا چہرہ خوشی سے چمکنے لگا لیکن سامنے ایک **ٹھیلے** والا کھڑا تھا۔

واہ نزہت ذرا ٹھہرنا وہ دیکھو تاج محل ہے' اس کی قیمت پوچھوں شاداں کو بہت شوق ہے ایسی چیزوں کا۔"

"ارے اس وقت نہیں پھر لے لیجئے گا۔" نزہت نے منہ بنا کر کہا۔

"چلو تو دیکھ لیں پھر کبھی لے لیں گے۔" وہ ضد کرتے ہوئے بولا۔

"وہ لوگ خود آتی رہتی ہیں اور ہزار بار نظر پڑی ہوگی' اس پر اگر شوق ہوتا تو خرید لیتیں۔ کیا فائدہ آپ اتنے خوش ہو کر خرید کر لے جائیں اور ان پر کچھ اثر ہی نہ ہو کوئی اور چیز پھر دے دیجئے گا۔ ابھی اس دن سالگرہ پر اتنے پیسے خرچ ہو گئے ہیں اور یہ شاپنگ اتنی کر لی ہے۔"

خالد نے کہا "اچھا چلو دیر ہو رہی ہے فلم شروع ہونے والی ہے وقت نکلا جا رہا ہے۔"

دونوں کی زندگی اسی طرح ایک ہموار راستہ کی طرح گزر رہی تھی۔ اور دونوں اپنی موجودہ حالت سے خوش تھے۔ نزہت گھر میں بڑی بڑی سوچا کرتی۔ آج ایسی کونسی چیز پکاؤں کہ خالد بار بار پوچھنے پر بھی اس کو بجھا نہ سکے ادھر خالد دفتر کا کام ختم کرتے ہی تیز تیز قدم بھرتا گھر آتا۔

دونوں اکیلے کبھی کہیں کسی یار دوست عزیز کے ہاں ہو آتے کبھی کوئی تفریح اکثر کوئی نیا پروگرام بناتے اور جب جانے کو دل نہ چاہتا تو دعوتیں دینا شروع کر دیتے۔ ان کے ابھی تک کوئی بچہ نہیں ہوا تھا مگر اپنے آپ کو تنہا بہلائے رکھتے کہ ایک دوسرے کو محسوس بھی نہ ہوتا۔ خالد کی بہن کے کئی بچے تھے وہاں جا کر وہ ان سے کھیلتا۔ بچوں کو ستانے میں بھی اس کا جواب نہیں تھا۔ کبھی کسی کو ہنسا دیا' کبھی کسی کو طمانچہ مار کر رلا ہی دیا۔ بہن چیختی رہ جاتی ارے بھائی صاحب اتنا نہ اچھالیئے کہیں زمین پر نہ آ رہے مگر وہ کہاں ماننے والا تھا۔ اپنی بہن ہی نہیں بلکہ خود اس کے بچوں سے بھی اسے بہت انس تھا۔

یہ لوگ ان بچوں میں بڑے ہر دلعزیز تھے۔ کھلونوں کی طرح ان سے کھیلتے اور بہلتے۔ اگر کبھی کوئی بڑی بوڑھی کہہ بھی دیتی۔ اللہ تم لوگوں کو بھی ایک کھلونا دے دے کتنا پیار کرتے ہو بچوں سے تو یہ لوگ ہنسی میں اڑا دیتے۔ ویسے ہی آبادی کم نہیں ہے ہمارے گھر میں کیا کم ہے گنتی پوری کرنے کے لئے۔

کبھی خالد کے گھر والے کبھی نزہت کے بہن بھائی یہاں تھوڑے بہت دن کو آجاتے تاکہ یہ لوگ گھبرائیں نہیں۔ خالد کو اپنے سسرال والوں کا بہت خیال تھا۔ ہنسی مذاق جو فطرت میں

شامل تھا کسی کو نہ چھوڑتا۔ خاطرومدارات کرتا نزہت بھی بہت ہنس مکھ ہوجاتی جب اس کے گھر والے آتے۔

ان کے یہاں مہمانوں کا تانتا بندھا رہتا۔ نزہت اکیلی گھبراتی تھی' للذا کوئی نہ کوئی موجود رہتا۔ اسے کچھ نہیں کھلتا تھا مگر اگر اس کی کوئی چیز چھوئے استعمال کرے جگہ سے بے جگہ ہوجائے تو اسے بہت غصہ آتا تھا۔ فرحاں کو اس نے اپنے پاس کچھ عرصہ کے لئے بلا لیا۔ وہ وہیں سے اسکول چلی جاتی۔ اس کے لئے تمام ضروریات کا علیحدہ انتظام کردیا مگر نزہت یہ چاہتی تھی کہ اس کی اپنی چیز کوئی نہ لے' چڑ تھی اسے۔ فرحاں کبھی یا اور خالد کے کسی گھر والے نے ہاتھ بھی لگایا تو اس کی تیوریوں پر بل پڑجاتے مگر خالد دفتری کاموں کی وجہ سے ان باتوں سے بے نیاز تھا۔

خالد کا تبادلہ ہوگیا دونوں میاں بیوی نئے شہر چلے گئے۔ خالد کو کافی غم تھا اپنے شہر سے جانے کا مگر نزہت نے سمجھا بجھا کر ٹھیک کرلیا چونکہ خالد کی زندگی میں پہلا موقع تھا جو وہ اپنے ماں باپ سے اتنی دور جارہا تھا۔ ماں بھی غم سے نڈھال ہورہی تھی لیکن سب مجبور تھے چونکہ وہ اور اونچے عہدہ پر بھیجا جارہا تھا۔ یہ لوگ چلے گئے۔

نیا شہر' نئی فضا' نیا ماحول ان کے لئے سب ہی کچھ تو نیا تھا اور مکان بھی بڑا شاندار ملا تھا۔ فرنیچر اچھا ہونے کے علاوہ گھر میں فون بھی تھا۔ اب بڑی آسانی تھی۔ دفتر سے ہر بات خود کرلیا کرتا۔ گاڑی ذاتی تو نہیں تھی لیکن سرکاری طور پر ملی ہوئی تھی غرضیکہ ٹھاٹ ہی ٹھاٹ تھے۔ دونوں یہاں آکر کافی صحتمند بھی ہوگئے تھے۔

خالد سوسائٹیوں میں ساتھ ساتھ نزہت کو رکھتا۔ اپنے عہدے کی وجہ سے اس نے گھریلو فضا بھی ویسی ہی کرلی۔ گھر پر شاندار دعوتیں اڑتیں اپنی تنخواہ میں سے تھوڑا سا وہ اپنے والدین کو بھیج دیا کرتا۔ دفتری مصروفیات بھی بڑھتی جارہی تھیں۔ یہاں تک کہ خط لکھنے کا وقت بھی اسے نہ ملتا۔

اس کی عدم موجودگی میں جو بھی آتا نزہت اس سے ملتی اور خالد کی ہدایت کے مطابق ان کو محسوس بھی نہ ہونے دیتی کہ خالد گھر پر نہیں ہے۔ چائے کھانا' کافی ہر چیز کا بہت سلیقہ سے انتظام کرتی اور اگر ضرورت پیش آتی تو خود ساتھ میں بیٹھ کر بے تکلفی سے گفتگو کرلیتی۔

خالد کی واپسی پر ساری رپورٹ سنا ڈالتی کہ کس طرح کس طرح اس نے خاطرومدارات کی۔ خالد بہت خوش ہوتا کہ میں نے اپنی بیوی کو اس قابل کرلیا ہے کہ لوگ رشک کریں مجھ

پر۔ ان کی بیویاں کیسی نکھٹو ہیں ذرا بھی سلیقہ نہیں بات کا۔
اکثر اس کے دوست بھی اسے داد دیتے ارے بھئی خالد بہت اچھا ٹرینڈ (Trained) کیا ہے تم نے۔ کس شان سے گفتگو کرتی ہیں تمہاری بیگم صاحبہ۔ خالد مسکرا دیتا۔
خالد اور نزہت میں مہمانوں کے رخصت ہونے کے بعد گفتگو ہو رہی تھی۔
"یہ صاحب تو مجھے قطعاً پسند نہیں بڑے عجیب سے ہیں۔"
"کیوں کیا بات ہے۔"
ان سے زیادہ تعلقات نہ بڑھایئے پتہ نہیں کیوں مجھے ان کا دیکھنا پسند نہیں۔"
"ارے چھوڑو ان باتوں کو تمہیں میرے دوستوں میں کوئی نہ کوئی برا ضرور لگتا ہے بلکہ یہ کہو جو مجھے مناسب لگتا ہے تم اس کو ناپسند کرتی ہو۔ وہاں بھی تم کسی نہ کسی پر تنقید کئے بغیر نہیں رہتی تھیں۔" خالد نے ٹال دیا۔
"میں تو مردوں کی نظر پہچانتی ہوں۔ آپ کے بعض بعض دوستوں سے تو دل چاہتا ہے پردہ کیا کروں۔"
"ارے کیا حماقت کی باتیں کرتی ہو۔ آپ بھلا تو جگ بھلا اہمیت ہی کیوں دیتی ہو ان باتوں کو؟"
نزہت کے لباس میں دن بدن ٹھاٹ آتے جا رہے تھے۔ یہاں آکر اس نے اپنے کو بالکل بدل لیا تھا۔ کپڑے نئی تراش کے پہننے لگی تھی۔ بال بھی مختلف وضع کے بنانے لگی۔ روزانہ کپڑے بدلنا اس کا معمول تھا۔ خالد کی بیرونی عدیم الفرصتی اس کے تغیر پر اس کی توجہ راغب نہ کرا سکی۔ وہ چاہتا تھا کہ نئے نئے راستے اپنی ترقی کے نکالے نیا ہونے کے باوجود کافی مقبول تھا۔ افسران اس کے کام سے بہت خوش تھے اور ماہ دو ماہ بعد اس کی تنخواہ میں اضافہ کر دیتے۔
اب تو رات گئے تک وہ گھر سے باہر رہتا۔ کام کی زیادتی سے اکثر وہ ایک بجے رات کو گھر پہنچتا اور تڑکے ہی کام پر چلا جاتا۔ واپسی پر نزہت کو ساری تفصیل سنا کر تسلی کر دیتا کہ کہیں نزہت کی خفگی اس کے کام پر اثر انداز نہ ہو۔ جاتے وقت بھی سمجھا کر چلا جاتا۔ میری مصروفیات تو تمہیں معلوم ہی ہے بڑھتی جارہی ہیں لیکن یہ عارضی ہیں۔ پچھلے کاغذات اکٹھا ہو گئے ہیں جو صاحب مجھ سے پیشتر اس جگہ پر تھے' ان کی لاپروائی ہے' لہٰذا مجھے سب (Set) کرنا ہیں۔ پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ذرا ہوشیاری سے دیکھ بھال کی ضرورت ہے۔ اگر دل بہت گھبرائے تو نوکر کو لے کر کہیں ہو آیا کرو اور ہاں تمہاری خالہ زاد بہن عفت بھی آگئی ہیں'

وہیں چلی جایا کرو طبیعت بہل جائے گی۔ بس ہاں ایک دو ماہ کے بعد پھر ہم لوگ اطمینان سے گھومیں گے۔ ابھی یہاں دیکھا ہی کیا ہے ہم نے۔

خالد جلدی جلدی دفتر جانے کی تیاری میں سرگرمی سے مصروف تھا۔ نزہت خالد کا سوئٹر بنا رہی تھی کہ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔

"ارے تم آؤ آؤ کون ہے یہاں" خالد نے تعجب سے کہا۔

"کون ہے بھلا" نزہت نے پوچھا۔

"یہ ہیں حضرت رومانی صاحب۔ لاحول ولا قوۃ تم تو ان کو اچھی طرح پہچانتی ہو اس دن دعوت میں بھی تو آچکے ہیں اور ایک دن میرے پیچھے بھی تو آئے تھے تم نے بتایا تھا کہ کوئی نئے صاحب آپ کو بڑی بے تکلفی سے پوچھ رہے تھے۔"

"اوہ سمجھ گئی آیئے آیئے اندر آجایئے یہاں میرے علاوہ اور کون ہوگا۔" نزہت نے بے تکلفی سے کہا۔

"اس وقت گاڑی کا لیٹ ہونا بڑا کھلا بور ہوگئے۔ ورنہ صبح تڑکے آتا۔ سوچا تھا جاکر تم لوگوں کو اٹھاؤں گا مگر۔"

"اور ہاں یہ کہاں کی تیاری ہے؟" رومانی نے پوچھا۔

"تمہیں نہیں معلوم میری مصروفیات اس حد تک بڑھی ہوئی ہیں کہ کھانے پینے کا ہوش نہیں ان سے پوچھو نزہت کی طرف تائید طلب کرتی نظروں سے دیکھتا ہے اور آج کل ہمارا باس (Boss) بھی تو آیا ہوا ہے منٹ بھر کو فرصت نہیں۔"

"اچھا تو میں چلا تم کہاں ٹھہرے ہو؟"

"ارادہ ہوٹل میں ہے مگر نزدیک تھا پہلے ادھر آگیا۔"

"اجی بس رہنے دیجئے شرم نہیں آتی رکھیئے اپنا سامان اور بھئی سنو نزہت ان کو خوب شاندار ناشتہ اور چائے وغیرہ۔

سامان برابر والے کمرے میں رکھوا دو۔ تم خود سب انتظام کرلوگی۔ انہیں بور نہ ہونے دینا، میں آج شام جلدی آنے کی کوشش کروں گا کنگھا پھیرتے ہوئے کہا۔ اچھا اب چلے.....! گھبرایئے نہیں حلیہ ٹھیک کیجئے نہا دھو کر پھر ناشتہ کرکے آرام کرنا چل نہ دینا کہیں شام کو ہم لوگ سب تفریح کو چلیں گے۔" رومانی کی پیٹھ ٹھونکتا ہوا وہ تیز تیز گھر سے نکل گیا۔ شام تک رومانی صاحب نزہت سے کافی بے تکلف ہوگئے خالد کی واپسی پر چائے کے بعد تینوں مل کر

گھومنے نکل گئے۔ راستہ بھر رومانی نزہت کی شان میں قصیدے پڑھ رہے تھے۔ ایک آدھ جملہ خالد کی طبع پر گراں بھی گزرا مگر اس نے کوئی خاص اہمیت نہ دی۔

رومانی تھوڑے دن تفریح کر کے چلے گئے وہ بھی اسی عہدے پر قریب ہی کے شہر میں تھے۔ لہٰذا خالد کے اور ان کے تعلقات کافی بڑھ گئے۔ ایک دوسرے سے بہت واسطہ پڑتا تھا۔ ادھر گھر سے آمد و رفت ہوئی بے تکلفی بڑھتی گئی۔

ایک دن خالد جب دفتر سے واپس آیا تو نزہت نے اطلاع دی کہ آج رومانی صاحب آئے تھے ذرا دیر بیٹھے تھے آپ سے کوئی خاص کام تو نہیں تھا۔ مگر ادھر ایسے ہی آگئے کہ شاید گھر پر مل جائیں۔ مایوس واپس لوٹے۔ سنیئے ادھر دیکھئے یہ آئسکریم سیٹ اور کچھ کتابیں دے گئے ہیں۔ کہنے لگے ابکی آؤں گا تو اس میں آئسکریم کھائی جائے گی۔ یہ کتابیں آپ کی تنہائی بہلانے کو جو آپ دن بھر اکیلی پڑی رہتی ہیں، میں نے رکھ لیں چیزیں کہ آپ کو بھی دکھاؤں۔"

"رکھ دو دیکھا جائے گا۔" بڑی بے رخی سے جواب دیا۔

اب نزہت اکثر یہ موضوع چھیڑ دیا کرتی کافی شریف نظر آتے ہیں۔ کتنا خیال رکھتے ہیں میرے لئے کبھی کوئی چیز لئے چلے آرہے ہیں' خالی ہاتھ تو کبھی نہ آئے شاید۔ نہ جانے کتنے تحفے لاچکے ہیں۔ اب ان کے احسان کا بدلہ بھی تو اتارتے رہنا چاہیے۔ بس ایک بار پارٹی کی تھی یا پہلی مرتبہ دعوت میں آئے تھے۔ ایک بار کتنی قیمتی ساریاں لاکر دی تھیں۔ رنگ کتنے دلفریب ہیں' ان ساریوں کے۔ ان صاحب کا ٹیسٹ کافی اچھا ہے۔ تعجب ہے کہ انہیں عورتوں کے پسندیدہ رنگ کیسے معلوم ہیں اور انتخاب بھی صورت و شکل کے لحاظ سے کرتے ہیں۔

تمہیں ادا کرو ان کے احسانات کا بدلہ فی الحال تو مجھے فرصت نہیں زبانی شکریہ ادا کر دوں گا۔ سوچنے کی بھی فرصت نہیں ہے مجھ کو دفتر کے کاغذات کچھ گڑبڑ ہیں۔ معاملہ فٹ بٹھانا مشکل ہو رہا ہے۔ بھئی تم جیسا مناسب سمجھو کرو میں نے تو منع نہیں کیا کبھی۔

آپ کو واقعی کمال ہے اب تک میری پسند کا اندازہ نہ ہوا کہہ رہے تھے آپ کا چہرہ کتابی ہے آپ مچھلیاں نہیں پہنا کیجئے جھمکے مناسب ہیں اس چہرے پر۔

"اور ہاں اس قدر سادگی سے کیوں رہتی ہیں۔"

میرے جہیز کی چیزیں بھاری ہیں وہ ہیں بھی پرانے ٹائپ کی مجھے قطعاً" پسند نہیں۔ ہلکی

ہلکی نازک نازک سی بنوایئے۔ اس قدر اجڑی ہوئی مت رہا کیجئے ویسے آپ کو کافی اچھی طرح رہنا چاہئے اور اپنی پوزیشن کے لحاظ سے آپ کے لئے یہ کوئی بڑی بات نہیں اور ہاں صورت ہی کا پاس کر لیجئے۔

"تم بس ہر وقت خود بینی میں مبتلا رہتی ہو۔ تنخواہ تمہارے ہاتھ میں آتی ہے جو چاہو خریدو جو دل چاہے کرو۔"

سو روپئے تو اماں ابا کو چلے جاتے ہیں پھر گھر کا پورا خرچہ میں کہاں تک کفایت شعاری سے کام کروں۔

"اتنے میں بھی آپ سے نہیں ہو سکتا تم شاید زندگی بھر مطمئن نہیں ہو سکتیں۔" اس نے نیم غصہ میں جواب دیا۔

جہاں میں نے اپنی کسی چیز کا تذکرہ آپ سے کیا آپ کو غصہ آجاتا ہے ذرا ڈھنگ سے نہیں سنتے اس سے غیر اچھے۔ ہمدردی کا جذبہ تو ہے ان میں۔ میں تو خود سادی ہوں اور باہر نکل کر دیکھئے افسران کی بیویاں کس ٹیپ ٹاپ سے رہتی ہیں حالانکہ صورت چڑیلوں کی سی مزاج پریوں کے سے۔

بابا مجھے اکیلا چھوڑ دو میں دفتر سے بھی اٹھ کر گھر آگیا ایک مسئلہ میں الجھا ہوا ہوں جس کا کوئی حل سمجھ میں نہیں آرہا۔

نزہت اٹھ کر چلی گئی۔

ان لوگوں کو پہلے ہی آپس میں بات کرنے کی فرصت نہیں ملتی تھی۔ اب خالد کی طبیعت دفتری حالات پر چڑچڑی سی ہو گئی تھی۔ اس کا زیادہ وقت دفتر ہی میں گزر جاتا۔ رات گئے تک وہ کام کیا کرتا۔ فون گھر پر موجود ہی تھا۔ دفتر میں اگر کام کی زیادتی ہوتی تو اطلاع کر دیتا۔ گھر پر نوکر تھے اس لئے وہ نزہت سے بے فکر تھا لیکن ان کاموں کی زیادتی سے خالد کی صحت گرتی جا رہی تھی سونے کو بھی کم ملتا تھا' وہ کافی حد تک چڑچڑا ہوا جا رہا تھا جو نزہت کی برداشت سے باہر تھا۔

آج صبح سے خالد کی طبیعت بہت پریشان تھی اور دماغ چکرا رہا تھا۔ وہ بغیر فون کئے گھر چلا آیا۔ باہر سے دروازہ بند تھا۔ اس نے کھٹکھٹایا اسے چکر آرہے تھے کھڑا بھی نہیں ہوا جا رہا تھا۔ لات مار کر دروازہ کھولا۔ سامنے نزہت بیٹھی رومانی سے مصروف گفتگو تھی رومانی بستر پر لیٹا ہوا تھا اور وہ اس کے بالوں میں انگلیوں سے کنگھا کر رہی تھی۔ خالد نے اپنے کانوں سے یہ

جملہ سنا جو نزہت بہت چہک چہک کر کہہ رہی تھی "ان کی مصروفیات آج کل اتنی بڑھ گئیں انہیں سر اٹھانے کی فرصت نہیں اور آپ چاہیں تو سارا وقت بے فکری سے یہاں گزاریں۔ ان کے فرشتوں کو بھی پتہ نہ چلے اور ہاں اگر چل بھی جائے تو میرا کر بھی کیا سکتے ہیں۔

یہ الفاظ خالد کے دماغ سے ٹکرائے وہ انتہائی برداشت کے باوجود دھڑ سے آ رہا۔ رومانی تیز تیز باہر نکل گیا چونکہ وہ جانتا تھا نزہت اپنے شوہر کو کیا بلکہ اپنا الو سیدھا کرنے میں ماہر ہے۔

نزہت نے آکر اٹھایا۔ پانی ڈالا اور ہوش میں لانے کی کوشش کر رہی تھی۔ خالد کی ایسی حالت ہونے کے باوجود نزہت کا چہرہ اطمینان بخش تھا۔

خالد نے منہ پھیر لیا لیکن اب اس میں اٹھنے کی طاقت بھی نہیں تھی اسے ایسا لگ رہا تھا کہ ساری قوتیں کسی نے سلب کر لی ہیں۔

نزہت نے مصنوعی انداز میں پوچھا۔ آپ اس قدر پریشان کیوں ہیں۔ آج اس وقت کیسے آگئے دفتری حالات تو ٹھیک ہیں ہوش میں آیئے دیکھئے آپ کی نزہت آپ کے پاس بیٹھی ہے۔

اس کے لب آہستہ آہستہ ہلے مرا خواب آج شرمندہ تعبیر ہوگیا۔ نزہت تم یہاں سے چلی جاؤ اب مجھے اپنے جال میں نہ پھانسو میں آج معاملہ کی تہہ تک پہنچ چکا ہوں تم جس بات کا روز رونا روتی تھی آج تم نے اس کے احسانات کا بدلہ اتار دیا۔ اچھا کیا میں زندگی بھر ایسا بدلہ نہیں دے سکتا تھا..... جاؤ..... ہاں ہاں..... جا..... ؤ۔

خالد کے چہرے پر ایک ایسی معصوم پژمردگی تھی۔ جیسے کسی بچے کا سب سے پیارا کھلونا ٹوٹ کر چور چور ہو گیا ہو۔

ایسا بھی ہوتا ہے

شیتل اور آشا اوپر تلے کی بہنیں تھیں۔ دونوں میں بہت دوستی تھی۔ یہ یہاں پڑھنے کے لئے آئی ہوئی تھیں۔ باپ کی بزنس چونکہ تنزانیہ میں تھی پیسے کی ریل پیل تھی۔ ان کے والدین نے لندن میں ایک مکان خرید کردے دیا تھا۔ شیتل چھوٹی تھی، مشکل سے بائیس کی ہوگی اور آشا اس سے صرف گیارہ مہینے بڑی تھی۔ چھوٹی نے قانون میں ڈگری لی اسی سال۔ آشا بھی پچھلے سال تعلیم سے فارغ ہوئی تھی اور کسی فرم میں ملازم ہوگئی تھی۔ ہفتہ اتوار کی چھٹی ہوتی، دونوں بہنوں نے گھر کی مختلف ذمہ داریاں سنبھالی ہوئی تھیں۔ آج ہفتہ کی چھٹی تھی۔ حسب معمول اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھیں۔ آشا نے ناشتے کے برتن سنک میں رکھے شیتل نے واشنگ مشین میں کپڑے ڈال کر اس کا دروازہ بند کیا۔

آج کیا پروگرام ہے تمہارا دیدی؟

شیتل شاید میں یہیں سے شاپنگ کروں گی تم کو کوئی خاص چیز چاہئے؟

پھل لینا نہ بھولنا۔

اور تمہارا کیا پروگرام ہے؟

سوچ رہی ہوں کہ چٹھیوں کے جواب دے دوں ابھی تو ڈاک خانے جاؤں گی پہلے۔

تو تم ہی کیوں نا شاپنگ بھی کرتی آنا واپسی میں۔

کیوں؟ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے بس سر میں درد سا ہے۔

دیدی نوید کیسا ہے؟ شیتل نے مشین میں صابن ڈالتے ہوئے سوال کر ڈالا۔

ٹھیک ہی ہوگا۔

اس قدر بے نیازی کیوں کیا جھگڑا ہوگیا ہے اس سے؟

نہیں وہ کل اپنے گھر والوں کے ساتھ پاکستان جارہا ہے۔

کیوں چھٹی پر؟

کیا بتاؤں نوید کے ماں باپ اس کو پاکستان شادی کے لئے لے جارہے ہیں۔

کس سے؟

اس کی بوا کی لڑکی سے؟

کیا مطلب؟

نوید کی پھوپھی کی بیٹی سے۔ سنا ہے خوبصورت بھی ہے اور گریجویٹ بھی۔

تم نوید کو جانے دے رہی ہو تم اس کے بغیر کیسے رہوگی دیدی۔

میں کیا کروں اس کو گھیر گھار کر لیئے جارہے ہیں۔

نوید کے وعدے قسمیں وہ سب کہاں گئے وہ تو مذہب کی بھی پروا نہیں کرتا تھا تم سے کہتا تھا کہ سچے پریم سے بڑھ کر کوئی دھرم نہیں۔

وہ مجبور ہے۔

تو کیا تم نے ہتھیار ڈال دیئے دیدی تم بزدل ہو' اب وہ زمانہ نہیں ہے کہ عورتیں ظلم سہیں۔ تم تاریخ دہرانا چاہتی ہو اکیسویں صدی آرہی ہے اور تم وہی دقیانوسی لڑکی' جس کو جلا کر بھسم کردیا جاتا ہے اور کہہ دیا جاتا ہے چولہا پھٹ گیا یا شوہر کے مرنے پر اس کو بھی اسی کی چتا پر رکھ کر آگ دے دی جاتی ہے۔ میری بہن کے ساتھ ایسا نہیں ہوسکتا۔

میری آشائیں کیسے پوری ہوسکتی ہیں۔ شیتل جذباتی نہ بنو دھرم کا سوال ہے۔

اس کے ماں باپ کسی غیر مذہب کی لڑکی سے شادی کی اجازت نوید کو نہیں دیں گے۔

یہ سب کیا نوید نہیں جانتا تھا' وہ ہوتا کون ہے میری بہن کی زندگی کو برباد کرنے والا اور اس معصوم روح کا۔

اس بچے کا کیا ہوگا یہی میں بھی سوچ رہی ہوں۔

پھر کیا کروگی دیدی شیتل نے آشا کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔

بس سمجھ لو بدنصیب ہوں اس سلسلے میں۔

ارے جاکر نوید کے ماں باپ کو سب کچھ بتادو۔

یہ کہ ان کے پوتے کی ماں بننے والی ہوں یا پوتی۔ ناجائز اولاد کی ماں یہ کس منہ سے کہہ سکتی ہوں۔

نہیں، نہیں یہ سب نہیں۔

کیا کروں شیتل ایک طرف ماتا اور پتا جی کا خوف دوسری طرف آنے والا بچہ پھر میری

محبت.......

دیدی یہ کس فلائٹ سے جا رہے ہیں؟ نوید اتنا بے حس اور بے وفا نہیں ہو سکتا۔

وہ کہتا ہے سب ٹھیک ہو جائے گا' اس وقت مجھے ماں باپ کی بات مان لینے دو۔

نہیں بہت دیر ہو جائے گی تیر کمان سے نکل چکا ہو گا پھر تم اس کو واپس نہیں لا سکتیں دیدی۔

پھر کیا کروں شیتل! جی چاہتا ہے دریائے تھمس میں چھلانگ لگا دوں۔

وہ زمانہ گیا جب لڑکیاں ظلم سہتی تھیں اور اندر اندر بھیگی لکڑی کی طرح سلگتی رہتی تھیں' اب کنڈوں اور بھیگی لکڑیوں کی طرح نہیں ہوتیں۔ اب زمانہ بدل گیا ہے دیر نہ کرو یہ بتاؤ کہ ان کی پاکستان کی فلائٹ کب کی ہے۔

کل صبح نو بجے کی پی آئی اے سے جا رہے ہیں۔ نوید کا ٹکٹ بھی بنوا لیا ہے۔

تم فکر نہ کرو جاؤ شاپنگ کرو شیتل نے آشا کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

دوسرے روز صبح آشا اور شیتل ہیتھرو ایئر پورٹ پر تھیں۔

دور سے انہوں نے دیکھا نوید اور اس کا چھوٹا بھائی ولید اور ماں باپ چیکنگ کے لئے قطار میں کھڑے تھے پھر وہ چاروں اوپر کی منزل میں ریسٹورانٹ میں بیٹھ گئے اور دستی سامان کے تھیلے میز کے برابر میں رکھے نوید چائے کی ٹرے لے کر خورد و نوش کا سامان لینے چلا گیا۔ شیتل اور آشا کی نگاہیں ان کا تعاقب کرتی ہوئی ان کے قریب آ گئیں۔

شیتل نے آشا سے کہا جاؤ گڈ لک ان کو تمام رام کہانی سنا دو بالکل نہ ڈرو۔

آشا کرسی گھسیٹ کر ان کے پاس بیٹھ گئی آداب آپ نوید کے امی ابو ہیں نا۔

ہاں ہاں ولید جو نوید جیسا ہی ایک نوجوان برابر میں بیٹھا تھا جی فرمائے نوید میرے بھائی کا نام ہے اور یہ ہمارے امی ابو ہیں کیا آپ اکیلی پاکستان جا رہی ہیں؟ آپ کی ہم کیا مدد کر سکتے ہیں؟ راستے میں ہم آپ کا خیال رکھیں گے۔

جی نہیں میں پاکستان نہیں جا رہی ہوں۔

اچھا بیٹی تو کیا تمہاری بہن جا رہی ہیں؟

جی نہیں آشا نے دھیمے لہجے میں کہا۔

پھر؟

بات یہ ہے کہ بات کچھ اور ہے؟

ہاں ہاں بیٹی کیوں؟ ابو نے پوچھا۔
میرے اوپر کرم کیجئے بھگوان کے لئے نوید کو نہ لے جایئے وہاں اس کی شادی نہ کیجئے۔
ارے لڑکی تم کون ہو یہ کیا اول فول بک رہی ہو نوید کے ابو نے ایک دم میز پر ہاتھ مارا
ہم دونوں ایک دوسرے سے پریم کرتے ہیں اتنا کہ سیتا اور رام نے بھی آپس میں نہیں کیا ہوگا۔ مجھے بن باس نہ دیجئے۔
چپ لڑکی زبان سنبھال! ہم نے اس کی شادی وہاں طے کردی ہے ماں نے کہا۔
ہم چار سال سے باہر ساتھ جاتے ہیں آپ کو نوید نے یہ سب نہیں بتایا؟ گستاخ لڑکی تم اس پر الزام لگا رہی ہو تم کو ہمارے کسی دشمن نے بھیجا ہے۔
نہیں ایسے نہ کہئے ٹھنڈے دل سے میری کہانی سنئے اور سمجھئے۔ میری بہن شیتل کھڑی ہے، وہ گواہی دے دے گی۔ آپ خود بھی میرے سامنے نوید سے پوچھ لیجئے۔
ولید جاؤ نوید کو بلاؤ ہماری فلائٹ میں دیر ہو جائے گی۔ یہ کوئی پاگل لڑکی ہے۔
ولید الٹے پاؤں بھاگا بھیا وہ دیکھو۔
نوید کے ہاتھ میں ٹرے تھی، جس میں کوک، چائے اور کچھ کھانے پینے کا سامان تھا، اس کے ہاتھ میں کشتی ہلنے لگی جیسے ہاتھ پاؤں پھول گئے ہوں چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ اس نے ٹرے ولید کے ہاتھ میں پکڑا دی اور برابر میں آکر کھڑا ہو گیا۔
نوید یہ کون لڑکی ہے؟ تم اس کو جانتے ہو؟ باپ نے پوچھا۔
نہیں میں نہیں جانتا یہ کون ہے اور کیا بکتی ہے؟
نوید خدارا ہوش میں آؤ ان کو سب کچھ بتا دو۔
نوید کیا معاملہ ہے؟ ماں نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔
شیتل بھی قریب آگئی میری بہن سب کچھ سچ کہہ رہی ہے ماں جی آپ کا بیٹا نوید آشا سے سچا پریم کرتا ہے۔
ماں باپ نے مشکوک نگاہوں سے نوید کی جانب دیکھا نوید نے شرم سے آنکھیں جھکا لیں۔
لیکن لڑکی تمہارا مذہب مختلف ہے تم کیا چاہتی ہو ہماری فلائٹ کا اعلان ہو رہا ہے۔ نوید جلدی بتاؤ ماں نے پوچھا۔ امی چھوڑیئے یہ مجھے بھول جائے گی سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ سامان اٹھایئے اب وقت نہیں ان فضول باتوں کا۔

چلئے یہاں تو گرل فرینڈز ہوتی ہیں ماں نے بریف کیس باپ کو پکڑایا۔

نوید نے آشا کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا وقت کی ستم ظریفی ہے صبر کرو تم مجھے بھول جاؤ گی یہ کہتے ہوئے وہ تیز تیز قدم بڑھاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

آشا اور شیتل سکتے میں رہ گئیں۔ نوید اور ولید دونوں اٹھے ماں باپ نے پاسپورٹ سنبھالے اور اندر چلے گئے۔ شیتل کی آنکھوں میں آنسو آرہے تھے۔ وہ ایک زخمی پرندے کی طرح پھڑپھڑاتی کرسی پر بیٹھ گئی۔

نہیں دیدی وقت اتنا بے رحم نہیں ہو سکتا چلو کچھ پیو گی یا گھر چلیں۔ بس گھر چلتے ہیں آشا نے جواب دیا۔

آشا ایک ہارے ہوئے جواری کی طرح گھر لوٹ آئی۔ ہوا یوں کہ اب شیتل اور زیادہ ہی بہن کا خیال کرنے لگی۔

نوید کی کوئی خبر نہ ملی۔ شیتل نے ایک مرتبہ فون گھمایا تو معلوم ہوا کہ نمبر کٹ گیا ہے۔

وقت گزرنے کے لئے ہی گزر رہا تھا کہ چند ہفتے جانے کیسے کوہ گراں کی سل بن کر آشا نے اپنے سینے پر رکھ کر گزارے۔

اتوار کا روز تھا سہ پہر کی اداس شام اپنے بے رحم موسم کے ساتھ آشا کو اور اداس کر رہی تھی۔ دروازے کی گھنٹی بجی سامنے غیر متوقع طور پر نوید کھڑا تھا مجھے معاف کردو آشا۔

اب کیا لینے آئے ہو تم کون ہو میں تم کو نہیں جانتی۔

آشا وہ سب ڈرامہ تھا ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ تمہاری اور میری شادی کی اجازت دیتے۔

اب تو تمہاری سگائی ہو گئی ہے بیاہ رچالیا میں تم سے ملنا نہیں چاہتی۔

مجھے اندر آجانے دو صرف ایک مرتبہ۔

تم جاؤ اب میں کسی اور جنجال میں پھنسنا نہیں چاہتی ہوں۔

پلیز صرف ایک بار۔

آشا نے دروازہ کھول دیا۔

نوید آکر صوفے پر بیٹھا آشا تم مجھے جانتی ہو نا!

پہلے تو نہیں جانتی تھی لیکن اس دن ایئرپورٹ پر تم کو جان گئی۔

ارے آشا میری جان سنو وہ سب ڈرامہ تھا اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا۔

اب کیا کہنے آئے ہو میرے پاس اب کیا رکھا ہے۔ میں نے امی ابو کی خوشی کے لئے

سب کچھ کیا۔

ہاں ہاں پھر۔

میں وہی نوید ہوں جو تھا صرف تمہارا اپنا۔

تو پھر تمہاری بیوی کا کیا ہو گا۔

وہ امی اور ابو کی بہو ہے میری بیوی نہیں۔

کیا مطلب؟

میں نے اس کو چھوا تک نہیں۔

میں نہیں مانتی تم کہتے تھے کہ وہ بے حد حسین ہے۔

تم سے زیادہ نہیں محبت تو اندھی ہوتی ہے نا۔

تم مجھے اب اور بے وقوف نہ بناؤ نوید۔ میں جان دے دوں گی۔

میں نے اس سے نکاح کر لیا۔

تم نے انکار کیوں نہیں کیا؟

خاندان کی عزت کا سوال تھا۔

لیکن وہ لڑکی کیا کہتی ہے۔

اس کو پوری کہانی معلوم ہے، میں نے سب کچھ اس کو ایمانداری سے بتا دیا ہے۔

پھر بھی وہ تمہارے ساتھ رہتی ہے۔

وہ اب بھی امید لگائے بیٹھی ہے یہ مشرقی لڑکیاں بس امید پر جیتی ہیں اور ہماری پاکستانی لڑکیوں کو باہر آنے کا شوق۔

تم کو ان پر رحم نہیں آتا؟

میں ان سے ہمدردی رکھتا ہوں لیکن محبت نہیں کر سکتا۔

تم نے برا کیا وہ تو تمہاری کزن ہے نا۔

ہاں ابو کی بھانجی ہے اور ان دونوں کی لاڈلی ہے بس ایک فرماں بردار بہو اور دکان میں کاؤنٹر پر کھڑی رہتی ہے۔

کیا میں اس سے بات کروں؟

نہیں وہ تو انگریزی سیکھنے کے شوق میں کسٹمر سے خوب باتیں کرتی ہے۔

ابو امی تم سے کچھ نہیں کہتے؟

ان کو سب پہلے سے معلوم تھا' میں نے انکار کیا وہ مجھے ضد کر کے زبردستی لے گئے
لیکن وہ اس دن ایئرپورٹ پر......
وہ سب ڈرامہ تھا۔
تم نے ایک معصوم پر ظلم کیا ہے۔
چند روز زندگی ایسے ہی وہ بور گزار دے گی پھر خود ہی مجھے چھوڑ کر چل دے گی۔
تم کو معلوم ہے نا کہ میں تمہارے بچے کی ماں بننے والی ہوں۔
جانتا ہوں سب جانتا ہوں آشا......... پھر آؤں گا۔

نوید کی دوہری زندگی گزرتی رہی اور نئی دلہن اندر ہی اندر کڑھتی مگر اس نے کسی سے نہ بتایا کہ نوید نے آج تک اسے چھوا نہیں ہے۔

وہ دکان میں کھڑی سگرٹوں اخباروں اور چاکلیٹ سویٹ کا کاروبار کر رہی تھی۔ ابو کو بھی دکان میں کم کھڑا ہونا پڑتا بس شام کو ٹل سے پیسے نکالنا اور کاغذی کاروبار دیکھ لیا کرتے۔ کبھی کبھی اماں بھی دوپہر کو کھانے کا وقفہ دینے آجاتیں۔ ابو امی کا رویہ بے حد پیار بھرا تھا لیکن دکان پر خریداروں کی آمد و رفت بھی بڑھنا شروع ہو گئی تانیہ کی روزمرہ کی انگریزی گفتگو میں بھی روانی آنا شروع ہو گئی لیکن یہ مزدوری اور غم جاناں کو وہ خاموشی سے سہ رہی تھی۔ اندر ہی اندر لاوا پک رہا تھا۔ ادھر لوگوں میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں کہ چوہدری کی بہو بانجھ ہے یا شاید فیملی پلاننگ کی ہے ورنہ دکان کون سنبھالے گا۔ ممانی یعنی تانیہ کی ساس کہتی بیٹی شام کو بن سنور کر تیار ہو جایا کرو اور وہ چوہدری صاحب سے کہتیں کہ شام کو آپ دکان پر آجایا کریں۔ تانیہ جانتی تھی کہ مجھے انہوں نے سستی مزدوری کی وجہ سے یہاں بلایا ہے۔

ایک روز تانیہ نے ساس سے کہا امی میں دکان میں کھڑی نہیں ہو سکتی ہوں کیونکہ آپ کے گھر میں خوشی آنے والی ہے
اے دلہن کیا تمہارا پاؤں بھاری ہے؟
تانیہ نے شرما کر آنکھیں نیچی کر لیں۔
اماں نے اوپر جا کر یہ خبر چوہدری صاحب کو سنا دی۔
اب بہو کی خاطریں شروع ہو گئیں۔
گھر کے ماحول کی اس تبدیلی کو نوید نے فورا" محسوس کر لیا۔
نوید کے کانوں تک بھی اڑتے اڑتے یہ خبر پہنچ گئی۔

اس نے تانیہ کو بلا کر کہا کیا ڈرامہ ہے میں تو تمہارے قریب بھی نہیں آیا تم کیسے بچے کی ماں بننے والی ہو۔

کیوں اگر تم ایک ناجائز بچے کے باپ بن سکتے ہو تو مجھے بھی یہ حق پہنچتا ہے۔

حرام زادی! نوید نے ایک طمانچہ اس کے منہ پر رسید کیا۔ یہ کیا کہہ رہی ہے گھر کی عزت خاک میں ملا دی۔

ارے یہ کیا؟ چیخ و پکار سن کر اماں کمرے میں آئیں۔

کیا جھگڑا ہے؟

اماں اس سے پوچھئے کہ اس کے پیٹ میں کس کا بچہ ہے؟

ارے یہ کیا کہہ رہے ہو بیٹے تم اس سے کبھی تو پیار سے بات کرو۔

تانیہ یہ کیا کہہ رہا ہے۔

ابا بھی شور سن کر آگئے۔

اتنی فرماں بردار میری بھانجی ہے خاموشی سے تم لوگوں کے ظلم سہ رہی ہے۔

یہ آپ نے نہیں سنا کہ وہ ایک بچے کی ماں بننے والی ہے۔

بیٹے کیوں خوش نہیں ہو؟ ہمارے خواب کی تعبیر پوری ہو رہی ہے۔ کتنی دعائیں مانگی ہیں اب وہ دن آنے والا ہے بیٹے۔

آپ سنئے نوید کہتا ہے اس نے تو اس کو آج تک ہاتھ بھی نہیں لگایا ہے۔

جھوٹ بولتا ہے ایسا کیسے ممکن ہے تم لوگ رائی کا پہاڑ بنا رہے ہو۔

ابو خدا کی قسم قرآن شریف اٹھا سکتا ہوں اس سے بھی قرآن شریف اٹھوا لیجئے۔

ارے بھئی دونوں ٹیسٹ ہو جائیں گے خون ٹیسٹ سے پتہ مل جائے گا۔

ماموں جان یہ بتائیے یہ جو رات دو دو بجے تک باہر رہتے ہیں اور آکر صوفے پر پڑ کر سو جاتے ہیں اور جہاں یہ جاتے ہیں وہاں ایک بچی پل رہی ہے مجھے سب معلوم ہے وہ کس کی بچی ہے وہ ان کی ہی ہے۔

بتاؤ بیٹے کیا آشا کی کوئی بیٹی ہے؟ وہ تمہاری بیٹی ہے؟

جی ابو نوید کی آنکھیں جو غصے سے سرخ تھیں ایک دم شرم سے نیچے جھک گئیں۔

اچھا تو پھر؟

میں اس کو یہاں لے آؤں گا میں نے اس کا نام صائمہ رکھا ہے۔

لیکن ہمارے گھر کی بہو بیٹیاں تو ایسی باتیں نہیں کرتیں ہیں بولئے امی۔

نوید اگر ہم اپنے بیٹے کی ناجائز اولاد کو پال سکتے ہیں تو اپنی بھانجی کی اولاد کو پالنے میں کیا حرج ہے۔

کیا کہا آپ نے؟ امی اور نوید کے منہ سے حیرت سے نکلا۔

ارے نوید میاں بھی تو ہم کو بار بار یہ سبق دیتے ہیں کہ زمانہ بدل رہا ہے وہ پرانے وقتوں کے لوگ تھے نئی نسل اور طرح سوچتی ہے ہمارا آپ کا جنریشن گیپ ہے یہاں رہیں گے تو یہاں کی تہذیب رسم و رواج کو اپنانا ہوگا۔۔۔۔۔ کیوں بیٹے؟

مگر ابو؟

ہاں بیٹے اگر یہ لڑکے کے لئے جائز ہے تو پھر مساوات وہ تو اسلام میں بھی ہے نا! کیوں بیوی؟ میں اس گھر سے چلی جاؤں گی جہاں حرام و حلال کا فرق نہیں خسر اور بہو آپس میں کیسی باتیں کر رہے ہیں۔

بیگم جب میں نے کہا تھا کہ بیٹے کو سنبھال لو تمہارے بیٹے کے ڈھنگ ٹھیک نہیں تو تم نے کہا تھا کہ شادی کے بعد ٹھیک ہو جائے گا۔ جوان ہے تم نے میری بھانجی کی زندگی کی بازی لگادی کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ آشا سے شادی کردو لیکن تم نے تو مذہب کے نام پر ایک ہنگامہ برپا کردیا تھا۔ اگر تم یہ گھر چھوڑنا چاہتی ہو تو جاؤ اپنے بیٹے کو بھی لے جاؤ دوسرا بیٹا جو جی چاہے کرے وہ بھی تو جوان ہے نوید سے ایک سال ہی تو چھوٹا ہے میں اپنی بیٹی کے ساتھ رہوں گا جو ایک وفا شعار بیٹی ہے۔

کیوں؟

ماں نے چیختے ہوئے کہا۔

تمہارے بچے نے اس روز ایک ڈرامہ کیا تھا اور آشا کو پہچاننے سے انکار کردیا تھا تم اپنے صاحبزادے کے کارنامے پر کتنا خوش تھیں تمہارے کوئی بیٹی نہیں ہے شاید اسی لئے؟ آج تانیہ نے بھی ڈرامہ کیا ہے تم نے خوشی خوشی جاکر شادی رچائی اور میرے گھر والوں کے ساتھ ساتھ مجھے بھی الو بنایا اب تم سے یہ مذاق برداشت نہیں آشا بھی اس میں شامل ہے ورنہ تانیہ کو یہ سب کیسے معلوم ہوتا کہ یہ ایک بیٹی کے باپ ہیں عقل استعمال کر عورت۔

یہ صاحبزادے اس سے سول میرج رچا چکے ہیں اور کلمہ پڑھا کر اسے مسلمان بھی کرلیا ہے۔ پوچھئے ان سے۔

اماں کے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ ابھی ابھی نوید سے کہو کہ تانیہ کو طلاق دیں اور ولید سے تانیہ کا نکاح کرتے ہیں اور پھر بارات آئے گی میں اس کا باپ اور تم ولید کی ماں آنکھوں پر پٹی نہ باندھو کوئی بچہ وچہ نہیں ہے۔
منظور ہے یہ فیصلہ یا میں تم کو طلاق دوں اور تم گھر سے چلی جاؤ اگر یہ تانیہ کو طلاق نہیں دیتے

نوید بھائی جلدی فیصلہ کیجئے ولید نے ہنستے ہوئے کہا۔
ٹھہرو تو۔
جلدی فیصلہ کیجئے بھابھی باہر کھڑی ہیں میں نے فون کر کے بلا لیا ہے آیئے آیئے آشا بھابھی۔۔۔۔۔ نہیں عائشہ بھابھی.......

مٹر پلاؤ

دروازہ کی گھنٹی سن کر وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ اس نے لائٹ جلائی اور دیوار پر لگے کلاک کو دیکھا تو رات کے ڈھائی بجا چاہتے تھے۔ اتنی رات گئے کون ہو سکتا ہے؟ کیا دروازہ کھولنا دانش مندی ہوگی؟ برابر والے کمرہ میں اس کی دو کرایہ دار یورپین لڑکیاں سو رہی تھیں مگر اس متواتر گھنٹیوں کی آواز نے اس بات پر مجبور کر دیا کہ وہ نیچے جا کر یہ ضرور معلوم کرے کہ دروازے پر کون ہے۔ وہ ہمت کر کے نیچے اتری اور بیٹھک کا پردہ کھسکا کر جھانکا تو دو لحیم شحیم پولیس مین کھڑے تھے۔ عذرا نے دروازہ کھولا۔ پولیس والے کہنے لگے "ڈرو نہیں' کیا تم مسز مارٹن ہو؟" نہیں میں تو مارٹن اسکاٹ کی لینڈ لیڈی ہوں۔ عذرا نے سہمی سہمی آواز میں جواب دیا۔ وہ اوپر کے باکس روم میں رہتا ہے مگر آج ابھی تک آیا نہیں ہے۔ ویک اینڈ پر وہ دیر سے آتا ہے' کبھی کبھی وہ شیفیلڈ چلا جاتا ہے' اپنی فیملی سے ملنے۔ کیا تمہارے پاس اس کے شیفیلڈ کے رشتہ داروں کا ٹیلی فون نمبر یا پتہ ہے؟ پولیس والے نے پوچھا۔ نہیں یہ سب کیوں چاہئے آپ کو؟ عذرا نے پریشان ہو کر پوچھا۔ بات یہ ہے کہ ابھی آدھا گھنٹہ پہلے اس کا ایک بہت ہی سیریس ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔

وہ کیسا ہے؟ وہ زخمی تو نہیں ہوا۔ اس کے کہیں چوٹ تو نہیں آئی؟ عذرا نے تلے اوپر کئی سوال پوچھ ڈالے۔ اس کی گاڑی ایک بجلی کے کھمبے سے ٹکرا گئی' وہ بالکل ٹوٹ پھوٹ گئی' اس کا آگے بیٹھا ہوا مسافر تو اسی وقت دم توڑ گیا لیکن مارٹن زخمی ہوا ہے' گاڑی وہی چلا رہا تھا۔ کیا ہم اس کا کمرہ دیکھ سکتے ہیں؟ ہاں ہاں ضرور شاید ہم کو کچھ اس کے گھر والوں کے سلسلے میں معلومات ہو سکیں۔ ہم کو ان کا پتہ چاہئے۔ ہاں ہاں ضرور عذرا بولی۔ وہ دونوں پولیس مین اپنے بھاری بھاری بوٹوں سمیت اس کے پیچھے تیز تیز قدم اٹھاتے زینے پر چڑھ گئے۔ ان پولیس والوں نے میز کی دراز اور کوٹ کی جیبوں کی بہت تیزی سے چھان بین شروع کر دی' اسی تلاشی میں ایک کاغذ اٹھاتے ہوئے ایک بولا۔ لو یہ ہے اس کا پتہ۔ اچھا میڈم آپ کی

کو آپریشن اور مدد کا بہت بہت شکریہ۔ وہ تیزی سے نیچے اترے۔ ذرا تو ٹھہریئے، مہربانی سے مجھے یہ بتادیں کہ مارٹن کیسا ہے اور اس کے کہاں چوٹ آئی ہے۔ اس نے حادثہ میں ایک ٹانگ کھو دی ہے اور میڈم ہم جلدی میں ہیں۔ یہ کہتے ہوئے دونوں باہر نکل گئے۔ عذرا اس قدر بوکھلا سی گئی تھی اور گھبراہٹ میں اس کا ذہنی توازن بھی درست نہیں رہا جو وہ مزید سوالات کرسکتی۔ دوسری کرایہ دار لڑکیاں اپنے کمرہ میں خراٹے لے رہی تھیں اور عذرا بستر پر مضطرب کروٹیں لے رہی تھی۔ مارٹن کا چہرہ اس کے تصور میں گھوم رہا تھا۔ ایک خوب صورت نوجوان بہت تمیزدار ابھی مشکل سے اس کو آئے ہوئے بھی چار چھ ہفتے ہوئے ہوں گے۔ عذرا نے تو کھل کر ابھی اتنی باتیں بھی مارٹن سے نہیں کی تھیں کیونکہ وہ ہمیشہ جلدی میں ہوتا تھا۔ صبح تڑکے ہی وہ کام پر چلا جاتا، شام کو اکثر دیر سے آتا۔ صرف رسمی گفتگو کے علاوہ ان کا آپس کا رابطہ بھی زیادہ نہیں تھا۔ کرایہ بھی وہ ہفتہ کی صبح نیچے میز پر رکھ کر چلا جاتا۔ اس نے عذرا سے کبھی رینٹ بک یا رسید بھی نہیں مانگی تھی۔ اس کی گفتگو میں ایک نکھار اور تہذیب کا رچ رچاؤ تھا۔ کسی اچھے خاندان کا پڑھا لکھا اور مہذب شخص نظر آتا تھا۔ عذرا بھی کنواری تھی اور اس ملک میں کئی برسوں سے رہ رہی تھی اور تھوڑے بہت پیسے بچا کر اس نے مارگیج کی رقم اکٹھا کرکے اپنے رہنے کے لئے ایک چھوٹا سا مکان لے لیا تھا۔ ایک مقامی دفتر میں وہ سیکریٹری تھی۔ اس صاف ستھرے مکان میں سے ایک کمرہ دو اسکاٹش لڑکیوں کو کرایہ پر دیا ہوا تھا اور چھوٹے کمرے میں مارٹن رہنے لگا تھا لیکن اس کو دیکھ کر عذرا کے دل میں ایک میٹھی میٹھی سی چبھن محسوس ہوتی اور اس کے اندر اس کو خالد کی شبیہ نظر آتی جو اس کا خالہ زاد بھائی ہونے کے ساتھ ساتھ اس کا منگیتر بھی تھا لیکن خاندانی چپقلش نے یہ رشتہ تڑوا دیا تھا اور ماموں جان نے خالد کی شادی امریکہ میں مقیم اپنے ایک دوست کی بیٹی سے طے کردی تھی اور اس سے پہلے کہ خالد امریکہ پارسل کیا جائے۔ عذرا اپنی ایک سہیلی کے ساتھ لندن آگئی اور ساری زندگی شادی نہ کرنے کا فیصلہ کرڈالا۔ پاکستان چھوڑنے کے بعد اس نے خالد سے کوئی رابطہ نہیں رکھا تھا لیکن مارٹن کی جھلک عذرا کے دل میں بجھی ہوئی راکھ میں ایک چنگاری چمکا رہی تھی۔ اس غم روزگار کی پن چکی کی آواز میں ایک محبت کے جذبہ نے جنم لینا شروع کردیا اور اس لے میں ہلکا ہلکا ترنم ابھرنے لگا، اسے عذرا جتنا دبانے کی کوشش کرتی اتنا ہی اس جذبہ بے اختیار کی تڑپ میں وہ کیفیت پیدا ہوتی چلی جارہی تھی جو خالد کے لئے وہ محسوس کرتی تھی۔ وہ اسی ادھیڑبن میں اکثر بستر پر لیٹی سوچا کرتی کہ ہم مشرقی

لڑکیاں تو کسی غیر مذہب یا دوسرے کلچر کے لڑکے سے دوستی تو کیا شادی کا تصور بھی نہیں کر سکتیں۔ ہمارے ملک اور ہمارے معاشرے کے لڑکے تو یہاں آتے ہی یورپین لڑکی سے دوستی کرتے ہیں اور جسمانی تعلقات بھی قائم کر لیتے ہیں۔ بے شمار لڑکیوں سے کھیل کر پھر کسی نیلی آنکھوں والی لڑکی سے بیاہ بھی رچا لیتے ہیں۔ ہمارا معاشرہ' ہمارے دوست و اقارب سب خوش آمدید کہتے ہیں لیکن ہماری اگر ایک لڑکی بھی کسی یورپین لڑکے سے دوستی کر لے یا اس کے ساتھ گھومتی پھرتی نظر آجائے تو ہمارا معاشرہ اس کو بہت ہی گھناؤنی شکل میں رسوا کرتا ہے اور افواہوں کے ہجوم میں پسپا کر دیتا ہے۔ ہمارا سماج' ہمارا نظام کیوں ایسا ہے' جہاں مساوات نہیں' جہاں مرد کو پوری آزادی ہے کہ وہ جو چاہے کر لے گو کہ وہ بھی کسی لڑکی کے ساتھ گھوم رہا ہے لیکن سارا کیا دھرا عورت پر آجاتا ہے پھر وہ یہ بھی سوچا کرتی کہ اگر میں یہاں انگریز لڑکے سے دوستی کر لوں تو وہ جذباتی لگاؤ کے ساتھ ساتھ جسمانی قربت کا مطالبہ بھی کرے گا پھر....؟ اس کی اپنی اقدار کسی مضبوط درخت کی جڑوں کی طرح اس کی ذہنی رگ و ریشے کو اپنی گرفت میں لئے ہوئی تھیں۔ وہ ان تمام اضطرابی الجھنوں میں پھنسی ہوئی تھی اور یہ طے بھی نہیں کر پائی تھی کہ بغاوت کر لے اپنے معاشرہ کی کھوکھلی روایات سے؟ مگر اچانک یہ حادثہ اس کے لئے ایک جان لیوا خلش بن گیا' ابھی تو وہ اس پیکر کو اپنے اندر تراش رہی تھی۔ یہ تصویر تو ابھی اس کے ذہن میں دھیرے دھیرے بن رہی تھی۔ ابھی تو عذرا کو اس تصویر میں کئی رنگ بھرنا تھے۔ اس نے سوچا بھی نہ تھا کہ یہ شیشہ اس کے ہاتھ سے گر کر ایک دم چور چور ہو جائے گا۔ اس نے ایک دم اپنے سر کو جھٹکا دیا اور بستر سے اٹھ بیٹھی۔ صبح کی پو پھٹ رہی تھی۔ آسمان میں ہلکی ہلکی زردی افق کے اس پار سے بکھرنا شروع ہوئی۔ وہ نیچے اتر کر آئی اور دیوار میں لگے ہوئے ٹیلی فون ریسیور کو اٹھا کر مقامی ہسپتال کا نمبر ملایا۔ "کیا آج رات آپ کے یہاں کوئی Casualty آئی ہے؟" نہیں آج ایسی کوئی رپورٹ حادثہ کی نہیں ہے۔ اس نے تین چار ہسپتالوں سے معلومات کیں۔ ایک ہسپتال میں دوسری طرف نرس بول رہی تھی۔ "جی ہاں میڈم! لیکن ہم آپ کو اس کی تفصیل نہیں بتا سکتے ہیں۔ آپ کون ہیں؟" میں.... میں.... اس گاڑی کے ڈرائیور کی لینڈ لیڈی ہوں۔ "سوری اس میں سے ایک مسافر تو وہیں حادثہ کے دوران اسی وقت مر گیا تھا' دوسرا جو گاڑی چلا رہا تھا' اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی۔ اس نے بھی آنے کے بعد یہی کوئی چالیس منٹ کے بعد دم توڑ دیا اور پولیس نے چھان بین کر کے ان کے رشتہ داروں کو اطلاع دے دی تھی وہ آکر اس کی باڈی لے گئے۔

اس سے زیادہ ہم آپ کو کچھ نہیں بتا سکتے۔" عذرا پر تو ایک بجلی سی گری' ریسیور اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور وہ دیوار سے لٹکا ہوا اس کو منہ چڑا رہا تھا کہ عذرا تمہارے خواب بکھر گئے اور اپنے سپنوں کو دیکھو!! صبح ہو گئی' نہ جانے کتنی صبحیں آتی رہیں اور شامیں گزرتی گئیں' مارٹن کا سامان اس کے کمرہ میں جوں کا توں پڑا تھا۔ اس نے جب بھی اس کمرہ کی طرف نظر کی تو اس کے کانوں میں ایک آواز گونجی۔

اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر لو
اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا

اس نے کمرہ کو چابی سے بند کردیا اور انتظار کرتی رہی کہ شاید اس کا کوئی رشتہ دار آکر اس کا سامان لے جائے' اس ناگہانی حادثے کو گزرے ہوئے آج دو ماہ گزر چکے ہیں۔ ایک دن فون کی گھنٹی بجی "کیا میں مارٹن کی لینڈ لیڈی سے بات کرسکتی ہوں؟" عذرا نے کہا "جی بول رہی ہوں!" دوسری طرف آواز آئی "میں مارٹن کی گرل فرینڈ ہوں!" آواز دھیمی دھیمی تھی۔ "مجھے افسوس ہے مارٹن کی موت کا' آپ میری ہمدردی قبول کریں" عذرا بولی۔ "وہ آپ کے ہاتھ کے پکائے ہوئے کھانے کی بہت تعریف کرتا تھا۔ ہم جب بھی ملے' اس نے کبھی کباب' کبھی مرغی کے سالن اور ہاں یاد آیا ایک دو مرتبہ آپ نے اس کو پیز پلاؤ (مٹر پلاؤ) کھلایا۔ مارٹن کو آپ کے کھانے کی خوشبو بہت پسند تھی۔ آپ اس کا بہت خیال رکھتی تھیں۔ لندن میں وہ اکیلا تھا۔ کہتا تھا کہ لیزلی (میرا نام ہے) بالکل جیسے ایک بڑی بہن شفقت سے کھانا کھلائے اور ہاں کہتا تھا کہ یہ ایشین بہت مہمان نواز ہوتے ہیں بلکہ اس کے مرنے سے ایک ہفتہ پیشتر تم نے اسے وہی ڈش (میں نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا ہاں مٹر پلاؤ) جو اسے بہت پسند تھی' بڑی تعریف کی تھی تمہاری اور تمہاری آنکھوں کی اور یہ بھی کہہ رہا تھا کہ تم بہت اسمارٹ ہو اور ساری میں بہت جاذب نظر لگتی ہو۔" تھینک یو عذرا نے کچھ اس طرح کہا جیسے موج سمندر میں سے بادل کی طرف بڑھے اور اسے ایک دم واپس پٹخ دے۔ لیزلی اس کی باتیں کر کے کچھ ایسے محسوس کر رہی تھی جیسے اس کی اس چوٹ کو عذرا بھی اسی طرح محسوس کر رہی ہو۔ "ہاں لیزلی بلکہ اس دن بھی جس دن اس کا ایکسیڈنٹ ہوا ہے' میں نے مٹر پلاؤ بنایا تھا۔ وہ نہا دھو کر نیچے آیا تھا اور اس نے کہا تھا بڑی اچھی خوشبو آرہی ہے تو میں نے اسی وقت پلیٹ میں نکال کردیا اور اس نے بہت خوش ہو کر کھایا اور بہت ہی تعریف کی کہ اس کی خوشبو مجھے بہت اچھی لگتی ہے۔ ایک دن میں تم سے اس کی Recipe پوچھوں گا

اور وہ چلا گیا۔" لیزلی نے کہا مجھے بے حد افسوس ہے' میں تمہارے غم میں برابر کی شریک ہوں اور ٹیلی فون بند ہو گیا۔

اس ہفتہ کے اندر ابھی مشکل سے تین چار روز ہی گزرے ہوں گے' مارٹن کا بڑا بھائی آیا' اسے تو اپنا تعارف کرانے کی بھی ضرورت نہ پڑی' وہ تو اس کا جڑواں بھائی لگتا تھا' بس فرق تھا کہ اس نے مونچھیں رکھی ہوئی تھیں۔ عذرا اس کو مارٹن کے کمرہ میں لے گئی۔ "تم اس کا سامان لینے آئے ہو نا۔" "جی ہاں" تمہارے ماں باپ نے اس غم کو کیسے سمیٹا ہے اور وہ کیسے ہیں؟ عذرا نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔ صبر کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس نے رومال جیب سے نکال کر آنکھوں کو صاف کیا۔

چیزیں سوٹ کیس میں بند کرتے ہوئے کہا کہ شکریہ آپ بہت اچھی خاتون ہیں' وہ کہتا تھا کہ پاکستانی عورتیں وفا کی پتلی ہوتی ہیں اور ہاں آپ کی ایک ڈش کی بہت تعریف کرتا تھا' وہ چاول جس میں آپ مٹر ڈالتی ہیں۔ اچھا میں چلوں گا۔ دروازہ بند ہو گیا۔ عذرا آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی اپنے کمرہ میں آئی اور سوچنے لگی لیزلی کو ایک اور بوائے فرینڈ مل جائے گا لیکن میرے مٹر پلاؤ کی خوشبو میں تو مارٹن اپنے پیار کی خوشبو چھوڑ گیا ہے جو اڑ کر میرے دل میں اتر گئی ہے لیکن وہ خود تو ریزہ ریزہ ہو کر افق کے اس پار چلا گیا ہے' جہاں وہ شفق کی خوشبو میں کتنے رنگوں میں بکھر گیا ہے۔ یہ سورج میری زندگی کا غروب ہو گیا۔ اب میں جو خالد کا عکس مارٹن میں دیکھ رہی تھی مگر مارٹن کا تو سایہ بھی مجھ سے جدا ہو گیا' اس کی پرچھائیاں افق کے اس پار بہت دور جا کر ڈوب گئی ہیں اور مجھے تیرنا نہیں آتا ہے۔ میں اس زیست کے سمندر میں کب تک ڈبکیاں لگاؤں گی.....؟

پگلی

حلوائی کی دکان ہماری گلی کے نکڑ پر تھی۔ گھر آتے وقت ہم لوگ اکثر اس دکان سے سموسے، دال موٹھ اور مٹھائی خرید لیا کرتے۔ چونکہ قریب ہی بس کا اڈا بھی تھا، لہٰذا آتے ہی وہ دکان سامنے پڑتی، وہاں اور بھی چھوٹی موٹی ضرورت کی دکانیں تھیں جیسے ڈرائی کلینز، کونے پر ڈاکخانہ بھی تھا اور چشمہ ساز یا کیمسٹ کی دکان۔ لہٰذا ہمارا گزر اس طرف ناگزیر ہی تھا۔ وہیں ڈاکخانے کے برآمدے کے برابر میں ایک ٹاٹ بچھائے منشی کانوں پر قلم رکھے بیٹھے نظر آتے اور کبھی کبھی کوئی ضرورت مند ان پڑھ عورت ان کے برابر میں بیٹھی اپنے سیاں جی کے نام چٹھی لکھواتی نظر آتی اور برابر ہی کوئی بزرگ کاندھے پر چادر ڈالے اکڑوں بیٹھے ہوئے جس کی پیشانی عمر کی تیوریوں سے بھرپور اور ضعیفی کی کمزوری سے جھکی ہوئی کمر اور بھی ٹیڑھی اور جھکی ہوتی۔ میرے کانوں میں جملے ایک عجیب سا دردمندانہ تاثر گھولتے کہ بیٹے آج مہینے کی بیس تاریخ ہوگئی اور تمہارا منی آرڈر ابھی تک نہیں ملا ہے۔ دھوبی کے تقاضے، دودھ والے کے چکروں سے میں اور تمہاری ماں دونوں ہی پریشان ہیں۔ میرا راستہ ہی وہ تھا ان دنوں میں ایک مقامی اسکول میں پڑھا کرتی تھی اور خاموشی سے سر جھکائے سر پر سفید دوپٹہ اوڑھے بغل میں بستہ دبائے گزرا کرتی۔ لیکن یہ مناظر فلم کی پرچھائیں کی طرح روزانہ کسی نہ کسی صورت میں میری آنکھوں کے سامنے سے گزر جاتے اور گھر آکر میں ان سب کو بھول کر اپنی دوسری مصروفیات میں گم ہو جاتی۔ کبھی کبھی ہم لوگ سودا خریدنے باہر نکلتے تو اماں بھی ہمارے ساتھ ہوا کرتیں۔ اکثر وہ واپسی میں کہتیں بیٹی مٹھائی کی دکان سے تھوڑی سی گلاب جامن یا قلاقند لینا ہے، کھانے کے بعد تمہارے باپ میٹھا مانگیں گے۔ میں چار و ناچار ان کے ساتھ دکان میں چلی جاتی اور وہ مجھے رشوت دینے کے لئے پیٹھے کی مٹھائی ضرور خریدتیں جو میری پسندیدہ چیز تھی۔

اس دکان میں داخل ہونے سے پہلے ایک پھٹی پرانی دری پر ایک عورت لیٹی نظر آتی،

جس کے برابر میں ایک پلاسٹک کی نیلے رنگ کی پلیٹ اور اور ایک نیلے ہی رنگ کے پلاسٹک کا گلاس اوندھا پڑا دکھائی دیتا۔ کبھی کوئی راہگیر رحم کھا کر اس میں چند سکے ڈالتا گزر جاتا۔ کبھی اس پلیٹ میں سموسہ یا کوئی سوکھی روٹی کا ٹکڑا بھی پڑا ہوتا۔ یہ اچھی طرح یاد ہے کہ یہاں اماں کیوں ایک مرتبہ رک کر ضرور اس میں روپیہ اٹھنی ڈال دیا کرتیں جب اماں مٹھائی خریدنے میں مصروف ہوتیں میں نیچے اتر کر اس عورت کے پاس آ کر کھڑی ہوجاتی اور اس کا غور سے جائزہ لیتی اور سوچا کرتی کیا بے کسی کا عالم ہے جانے کس کی ماں ہے وہ اکثر سوتی ہوئی نظر آتی۔ کپڑے بھی میلے کچیلے بوسیدہ مگر کبھی خیال ہی نہ آیا کہ کچھ اور بھی سوچا جائے۔ اپنی اپنی ڈفلی اپنا اپنا راگ۔ اماں کو بھی وقتی طور پر اس پر رحم آتا اور وہ بھی بڑبڑاتی ہوئی میرے ساتھ چل پڑتیں۔ آج کل کی کیسی اولاد ہے دیکھو اس بیچاری کو یہاں ڈال گئے ہیں۔ میں اپنے بچپن کے کھلنڈرے پن میں محو اور اپنے آپ میں مگن گھر آجاتی۔ کبھی خیال بھی نہ آتا جیسے راستے میں فقیر ملا کرتے تھے۔ کچھ عادی سے ہوگئے تھے اس معاشرے میں رہنے کا اور اپنی بے حسی کا احساس بھی نہ ہوتا۔

ایک روز ہم لوگ ادھر سے مٹھائی کی دکان میں جا رہے تھے۔ وہاں کچھ خالی خالی پن محسوس ہوا، میں نے اماں سے کہا کہ ارے وہ عورت کہاں گئی۔ اماں بولیں ابھی پچھلے دنوں سردی تھی یا تو اکڑ کر مرگئی یا پھر کوئی دکھیارا اس کو اٹھا کرلے گیا۔

اماں نے گھر آکر ابا سے ذکر کیا۔ وہ کبھی کبھی ابا سے اس کا تذکرہ کرتیں مگر سب اپنی اپنی ذمہ داریوں کے بوجھ میں کہاں یاد رکھتے ہیں لیکن اچانک اس کی غیر موجودگی اماں کو کھل گئی اور وہ ابا سے بار بار کہتیں "نہ جانے کہاں چلی گئی وہ بیچاری" ابا نے کہا "یا تو رات میں کسی نے اس کو گاڑی سے کچل دیا ہوگا یا پھر بیماری سے ختم ہوگئی۔" بھیا کو بھیج کر اماں نے پوچھوایا لیکن کوئی خیر خبر نہ ملی۔ ہر ایک نے یہی جواب دیا کچھ خبر نہیں کس کی بکری کون ڈالے گھاس، بات آئی گئی ہوگئی۔

برسوں گزر گئے اپنی اپنی زندگیوں میں مصروف۔ میری شادی ہوگئی میں بھی انگلستان آگئی۔

ایک عرصہ کے بعد اتفاقاً" ہم لوگ جب پاکستان گئے تو میرے ساتھ میرا بچہ بلال جو چھ یا سات سال کا تھا۔ انگلی پکڑے چل رہا تھا۔ میں سموسے لینے کے لئے پھر اسی مٹھائی کی دکان میں داخل ہوئی تو اسی جگہ پر ایک مرد لیٹا ہوا تھا اور برابر میں ایک کشکول پڑا تھا۔ بلال نے مجھے

جھنجھوڑا "ممی یہ آدمی یہاں کیوں لیٹا ہے۔ یہ کون ہے" میں نے کہا "بیٹے یہ فقیر ہے' جاؤ تم اس میں پیسے ڈال دو۔" اس نے پوچھا "کوئی اٹھا کر تو نہیں لے جائے گا۔" میں نے کہا "نہیں "بلال نے چند سکے اس میں ڈال دیئے لیکن وہ مجھ سے راستے بھر سوالات کرتا رہا "ممی پاکستان میں فقیر ہوتے ہیں ان کو حکومت پیسے نہیں دیتی۔ ان کے پاس گھر بھی نہیں ہوتا' ان کو سردی نہیں لگتی۔" میں اس کو ٹالتی رہی لیکن وہ تو اس قدر پریشان تھا حالانکہ اس نے انگلستان میں انڈر گراؤنڈ میں بھی چند لوگوں کو ساز بجاتے گانے گاتے ہوئے مانگتے دیکھا تھا لیکن یہ منظر اتنا دردناک تھا کہ اس کے دل پر اس کا بہت اثر ہوا۔ اس نے آکر نانی سے کہا مجھے اچانک وہ عورت یاد آگئی۔ میں نے اماں سے کہا "یاد ہے جب میں اسکول میں پڑھتی تھی تو اسی جگہ پر ایک عورت لیٹی رہتی تھی اور آپ اس کو اکثر پیسے یا کچھ کھانے پینے کا سامان دے دیا کرتی تھیں۔" اماں کو وہ کہانی یاد آگئی۔

"ہاں! بیٹی اس عورت کی کہانی بعد میں پتہ چلی۔ خالہ اماں جو کالونی میں رہتی تھیں' انہوں نے مجھے سارا قصہ بتا دیا لیکن تم چھوٹی تھی' اس لئے میں نے تم سے مخفی رکھا۔ میرے تجسس نے مجھے ایکدم جھنجھوڑ ڈالا۔ میں وہیں کی وہیں بیٹھ گئی۔" ہاں اماں مجھے بتایئے وہ عورت کون تھی۔ لوگ اسے پگلی کہا کرتے تھے۔

"ہاں بیٹی! وہ زیادہ پڑھی لکھی تو نہیں لیکن ایک اچھے گھرانے کی لڑکی تھی۔ اردو' قرآن شریف پڑھانے وہ محلے میں جاتی تھی اور نماز بھی لڑکیوں کو سکھاتی۔ لیکن خالہ اماں نے بتایا کہ وہ اچانک غائب ہوگئی۔ محلے والے سمجھے کہ اس کی شادی ہوگئی یا کہیں اور شفٹ ہوگئی مگر پھر پتہ چلا کہ وہ پاگل ہوگئی اور اگر کسی جوان لڑکے کو دیکھتی تو اس کے پیچھے بھاگتی اور بچوں کو پتھر مارا کرتی۔ ایک دن اسی طرح وہ پتھر لئے دوڑ رہی تھی کہ اچانک ایک کار سے اس کی ٹکر ہوگئی اور اس ایکسیڈنٹ میں اس کی ٹانگیں بیکار ہوگئیں اور پھر وہ وہاں پڑی رہتی اس کے گھر والے بھی اس سے عاجز آگئے تھے۔ اس حادثے کے بعد وہ خاموش رہنے لگی۔ کچھ پتہ نہیں چلا۔ خالہ اماں نے بتایا کہ اس کے مرنے کے بعد جہاں اسے دفن کیا گیا' وہاں پھر ایک صاحب نے آنا شروع کردیا۔ وہ آکر اس کی قبر پر بیٹھا کرتے اور پھول ڈالتے' فاتحہ پڑھتے اور گھنٹوں رویا کرتے۔ لوگ یہ منظر دیکھتے مگر کسی کی ہمت نہ ہوتی کہ ان سے پوچھیں کہ آپ سے اس کا کیا رشتہ تھا۔ تمہارے ابا کا جب انتقال ہوا تو اتفاق سے ان کو بھی وہیں جگہ ملی۔ ناصر تمہارے ابا کی قبر پر جب فاتحہ پڑھنے گیا تو وہ صاحب وہاں پر زار و قطار رو رہے تھے اور

معافیاں مانگ رہے تھے۔ اس جذبات میں وہ اتنے محو تھے کہ ان کو محسوس ہی نہیں ہوا کہ کوئی لڑکا ان کے برابر ہی میں کھڑا ہے جب وہ ہوش میں آئے تو ناصر نے ان سے پوچھا "چچا میاں یہ کس کی قبر ہے جو آپ اس قدر دھاڑیں مار رہے ہیں اور معافی مانگ رہے ہیں اور پہلے بھی آپ کو لوگوں نے یہاں آکر زار و قطار روتے دیکھا ہے۔" انہوں نے کہا "بیٹے تم جوان ہو اور جوانی دیوانی ہوتی ہے۔ اس میں ایسی غلطیاں ہو جاتی ہیں جن کا خمیازہ ہم کو زندگی بھر بھگتنا پڑتا ہے اور کبھی کبھی ہمارا ضمیر ہم کو کبھی معاف نہیں کرتا۔ کچھ میری بھی کہانی ایسی ہے۔" چچا میاں اگر آپ مجھ سے اپنے دل کی بھڑاس نکال لیں اور ہو سکتا ہے کہ ہم ایسے نوجوانوں کو کچھ اس کہانی سے سبق بھی ملے۔ وہ ان سفید پوش بزرگ کو گھر لے آیا۔ انہوں نے بتایا کہ یہ خاتون ان کے محلے میں رہا کرتی تھیں بے حد پاک باز' معصوم' خوبصورت عورت تھی۔ محلے کے بچوں کو قرآن شریف پڑھانے جاتیں' جوان تھیں اور خوش شکل تھیں۔ کسی نے بتایا تنہا تھیں شاید جوانی میں بیوہ ہو گئی تھیں۔ یہ محلے کی لڑکیوں کو قرآن شریف پڑھانے جاتی تھیں۔

میری بیوی کو بھی قرآن کا درس دینے آتی تھیں۔ ایک روز گھر والے معہ بچوں کے باہر مہمان گئے ہوئے تھے۔ یہ آئیں دروازہ کھٹکھٹایا' میں نے کھولا بجائے اس کے کہ میں کہوں کوئی گھر میں نہیں ہے۔ میں نے کہا بیٹھیے وہ اندر آگئیں۔ اور میں نے اندر سے دروازہ بند کر دیا اور ان کو اپنی ہوس کا نشانہ بنا لیا۔ یہ ہمیشہ سفید کپڑے پہن کر آتی' بس ایک حور کی طرح مجھے مقدس اور پاکیزہ نظر آتیں۔ میں مجبور ہو گیا اور میری نیت اچانک خراب ہو گئی۔ بعد میں فوراً" میں نے اس سے معافی بھی مانگی' یہ روتی دھوتی گھر چلی گئیں' پھر ان کا کہیں پتہ نہیں چلا۔ میں بھی دبئی چلا گیا اور بہنوں کی شادیاں ہو گئیں۔ میں بھول تو گیا لیکن کبھی کبھی مجھے خیال آتا کہ وہ بیچاری بیوہ کہاں ہو گی لیکن کسی سے پوچھنے کی ہمت نہ پڑتی کہ میں کس سے اس عورت کا حال معلوم کروں مگر کبھی کبھی مجھے میرا ضمیر بہت ہی تنگ کرتا۔ پھر معلوم ہوا کہ وہ عورت پاگل ہو گئی ہے اور ہر خوبصورت لڑکے کے پیچھے پتھر لے کر دوڑتی ہے اور اس کے ساتھ حادثہ ہوا پھر وہ حلوائی کی دکان کے نیچے پڑی رہتی۔ میں ایک روز اس کے قریب گیا تو وہ ایکدم اٹھ کر بیٹھ گئی اور کہا ارے تو نے میرا یہ حال کیا ہے۔ لوگوں نے کہا کہ ارے یہ تو پاگل ہے سب کو دیکھ کر یہی کہتی ہے' وہ چیختی رہی' بال نوچتی رہی اور میں فوراً" گاڑی میں بیٹھ کر بھاگا اور دوسرے روز پھر میں نے ہمت کی کہ جا کر معلوم کروں تو پتہ چلا کہ وہ مر گئی اور اس کا

کفن دفن بھی مٹھائی والے اور تمام آس پاس کی دکان والوں کے چندے سے ہوگیا۔ میں نے جاکر اس کی قبر کا پتہ معلوم کیا۔ اور اس کو پھر پختہ کروا دیا۔ وہ تو اس مٹھائی والے کی دکان کا اشتہار تھی۔ مٹھائی والا کہتا ہے جب سے وہ مری ہماری دکان کی سیل بھی کم ہوگئی۔ وہ لوگ برکت کے لئے مٹھائی، سموسے ڈال دیا کرتے تھے اور وہ ہاتھ اٹھا کر نگاہوں سے بھی ان کو دعا دیتی تھی۔ میں ہوں وہ گناہ گار جس کی بدولت وہ شریف زادی اس حال کو پہنچی۔ بیٹے یہ کہانی ہے جو تم پہلے نوجوان ہو جس کو میں سنا رہا ہوں۔ وہ پاگل تھی لیکن سب لوگ اس کا خیال رکھتے تھے، کوئی اس پر رضائی ڈال دیتا تھا، کوئی پانی کی صراحی لا کر رکھ جاتا تھا۔ وہ پگلی لوگوں کی محبت پا گئی لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ میرا ضمیر مجھے ہر وقت ستاتا ہے بس یہی ایک طریقہ ہے کہ میں آکر اس کی قبر سے لپٹ لپٹ کر معافی مانگتا ہوں۔" ہم لوگوں نے ان کو تسلی دی۔ اور ایک دن جب ناصر تمہارے ابا کی قبر پر گیا تو پتہ چلا کہ وہ اجنبی وہیں پر مردہ پایا گیا۔ ایک دن ان کا پتہ چلا کہ ان کی وصیت تھی کہ اگر وہ مر جائیں تو انہیں اس کے پہلو میں ہی دفن کر دیا جائے تاکہ وہ قیامت تک اس سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتے رہیں۔ شاید وہ یا خدا دونوں ہی ان کو معاف کر دیں۔

اماں نے جب کہانی ختم کی تو ان کی آنکھیں نم تھیں اور میری آنکھوں سے ٹپکے ہوئے آنسوؤں نے ایک لفظ زمین پر لکھا۔ بلال نے آنسو پوچھے اور کہا "ارے ممی آپ اس عورت کے لئے رو رہی ہیں وہ تو پگلی تھی۔"

فراز کی عیدی

رمضان کا زمانہ ہے۔ گھر میں حسب معمول ہنگامہ ہے اور خاص طور سے افطاری کے وقت گھر کا ہر فرد ہی کچھ نہ کچھ کرتا نظر آتا ہے۔ امی اگر پکوڑے تل رہی ہیں تو فریحہ فالودہ کی تیاری میں مشغول' شازیہ پھل کاٹ رہی ہے۔ فواد پر میز لگانے کی ذمہ داری ہے۔ ابو وضو کرنے غسل خانے میں مصروف ہیں۔ نہیں ہیں تو فراز جو غالباً" اپنے کمرے میں بند ہیں۔
"امی کھجوریں کہاں ہیں؟" فواد نے امی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر سوال کیا۔ "فرج میں دیکھو نا میرے پکوڑے جل جائیں گے اور ہاں بیٹے اس میں سے ذرا شامی کبابوں کا قیمہ بھی نکال دو۔ " امی نے زور دیا "کیوں" فریحہ بولی "امی اب اتنی چیزیں ہو گئی ہیں' شامی کباب رہنے دیں" فواد نے کہا۔ کل اگر عید ہو گئی تو پھر۔ صبح صبح سب کو تیار ہو کر مسجد بھی جانا ہے تو پھر تھکن نہیں ہوتی ہے۔

"ارے میرے دوپٹہ پر لچکا بھی تو آپ کو ٹانکنا ہے" فریحہ بولی۔

اور ہاں جناب مہندی تو امی سب سے اچھی لگاتی ہیں' آپ سے لگواؤں گی' شازیہ نے پیچھے سے گلے میں بانہیں ڈالیں۔

فراز نیچے اترو ذرا تم کو بھی کچھ دلچسپی لینا چاہئے۔" ابو نے تولیہ سے منہ پوچھتے ہوئے کہا۔

"ابو ابھی آتا ہوں میرا روزہ نہیں ہے' آپ لوگ کھولئے۔"

"جی صاحبزادے آپ کو کام کے لئے بلایا جا رہا ہے۔ صبح سے اوپر ٹنگے ہوئے ہیں۔" ابو نے زور سے کہا۔

فراز صاحب ہاتھ میں کنگھا لئے نیچے اترے اور اسٹائل مارتے ہوئے آئینہ کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔

ارے بھئی امی اور بھائی بہنوں کے ساتھ جا کر باورچی خانے میں کچھ مدد کرو افطاری کا وقت ہونے میں دیر نہیں ہے۔

"بس بھائی جان تو بالکل عامر خان لگتے ہیں کیوں فریحہ" شازیہ بولی۔

"نہیں یہ تو بالکل سلمان خان کی شکل ہیں، آنکھیں اور بالوں کا اسٹائل" فریحہ نے بات کاٹی۔

"اچھا چلو میرے بچے کو پریشان مت کرو، وہ اپنے کمرے میں کمپیوٹر پر اپنے امتحان کی تیاری کر رہا ہے، کس قدر محنت کرتا ہے میرا بچہ۔" ماں نے دونوں کو ڈانٹا۔

جی ہاں بس رہنے دیجئے اپنے لاڈلے کی باتیں۔ آپ کو معلوم ہے، ابھی اوپر سے غسل خانے سے وضو کرکے نکلا ہوں۔ صاحبزادے .C.D لگا کر مڈونا کا نغمہ سن رہے تھے، وہ ان کے امتحان میں آئے گا نا میرا تو روزہ بھی مکروہ ہوتا ہے۔ یہ لغو قسم کی آواز سن کر۔

ابو نے طنز کیا۔

"ابو آپ کو کیسے پتہ کہ وہ مڈونا کا گانا تھا؟" فواد نے زیر لب مسکراہٹ چھپا کر پوچھا۔

"ارے بھئی یہ مائیکل **جیکسن** اور مڈونا کی آوازیں تو اس گھر میں بازگشت کی طرح گونجتی رہتی ہیں۔" ابو نے چہرہ پر سنجیدگی لانے کی کوشش کی۔

"آپ شازیہ کو کچھ نہیں کہتے۔ جب یہ مادھوری کی طرح مسکرانے کی کوشش کرتی ہے۔" فراز بولے۔

"بھائی جان آپ کو کیسے معلوم؟" فواد نے پوچھا۔

"لو وہ اکثر مادھوری کا پوسٹر دیکھتی ہے اور پھر آئینے کے سامنے جا کر ویسے ہی شکلیں بناتی ہے۔" فراز نے کہا۔

"بالکل جھوٹ ایک دم جھوٹ ابو" شازیہ نے صفائی پیش کی۔

"اچھا چلو چلو روزہ خراب نہ کرو۔ میز پہ آجاؤ۔" امی نے موضوع بدلا۔

فراز نے ٹی وی کھولا۔ میاں یہ ٹی وی بند کردو۔ ابو نے پیار سے کہا۔

ابو مجھے Neighbours دیکھنا ہے پلیز۔

لاحول ولا قوۃ..... یہ ..... Neighbours کا وقت ہے یا خدا کو یاد کرنے کا۔ ابو نے خفگی کا اظہار کیا۔ "بیٹے فراز ادھر آجاؤ۔" امی نے لہجے میں نرمی اختیار کی۔ "ہم نے تو دوپہر ہی دیکھ لیا تھا۔" شازیہ نے کہا۔

"اور کیا ہماری سب کی ہاف ٹرم ہے نا" فریحہ نے قہقہہ لگایا۔

اور Home and Away بھی تو۔" فواد نے لقمہ دیا۔

''ان لوگوں کے روزے مکروہ نہیں ہوئے۔ یہ دیکھنے سے ابو سنا آپ نے یہ دوپہر میں یہ پروگرام دیکھتی ہیں بجائے ظہر کی نماز پڑھنے اور قرآن شریف کی تلاوت کرنے کے۔'' فراز نے ابو کو اپنی طرف کرنے کے لئے کہا۔

ابو نے ٹی وی بند کیا اور فراز بھی چاروناچار میز پر آگئے۔

ریڈیو پر روزہ افطار کا اعلان ہوا۔ ''اچھا کھجور سے سب روزہ کھولو۔'' امی نے یاد دلایا۔

''امی مجھے پکوڑے دیں۔'' فواد نے ہاتھ بڑھایا۔

''میں نے کب کسی کا ہاتھ روکا ہے' یہ لو اور مجھے فالودہ کا جگ بڑھادو فریحہ'' امی نے کہا۔

ریحانہ (امی) بیگم آپ کو آج کا روزہ بہت لگا۔'' ابو نے کہا۔

''نہیں روزہ نہیں مجھے کل کی فکر ہے اور میں نے عید کی شام کے لئے چند لوگوں سے کہہ دیا ہے کہ کھانا ہمارے ساتھ کھائیں۔'' امی نے جواب دیا۔

فراز بیٹے تم سفید شلوار قمیض پہن لینا کل نماز کے لئے جانا ہے۔'' ابو نے کہا۔

''مجھے ایک پارٹی میں جانا ہے۔ مجھے وہ کپڑے نہیں پہننا' میں کل نہیں جاؤں گا۔'' فراز نے کہا۔

''بیٹے کل ہم سب لوگ ریجنٹ پارک چلیں گے۔'' امی نے سر پر ہاتھ رکھ کر اصرار کیا۔

''یہ سب فرسودہ باتیں ہیں۔ میں عید وید نہیں مانتا' مجھے تو کالج جانا ہے۔''

''ارے بھئی ایک روز کی چھٹی لے لینا۔'' ابو نے دخل دیا۔

''کل میری کلاس ہے اور میرا امتحان بھی قریب ہے نا'' فراز نے عذر پیش کیا۔

''ابو کار سے چلیں گے؟'' شازیہ نے پوچھا۔

''وہاں تو پارکنگ کی بہت دقت ہو جاتی ہے'' ابو بولے۔

''نہیں تو پھر میں نہیں جاؤں گی مجھے پاکستانی کپڑوں میں سڑک پر شرم آتی ہے۔'' شازیہ بولی۔ ''اور وہ بھی جھلمل جھلمل کرتے کپڑے'' فریحہ نے تعاون کیا۔ ''بات تو بچیاں ٹھیک کہتی ہیں۔'' امی نے تائید کی۔ ''ابو مل جائے گی جگہ دوسری نماز میں چلیں گے تو کچھ لوگ چلے گئے ہوں گے۔'' فواد نے مشورہ دیا۔

''اچھا بھئی ٹھیک ہے' یہ میرا مسئلہ ہے۔'' ابو نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔

''امی لیکن میں میں کیسے؟'' فراز نے پوچھا۔

''ہماری تو اسٹیٹ کار ہے کیا مطلب تمہارا؟'' ابو نے رعب جھاڑا۔

"ارے بھئی میں بات کر رہی تھی کل شام کے کھانے کی۔ گاڑی سے جائیں گے تو جلدی آجائیں گے۔ فریحہ شازیہ چلو نماز پڑھ لو۔"

"ارے امی وہ ہری مرچیں مسالحے والی ضرور تل لیجئے گا' نجمہ خالہ کو بہت پسند ہیں۔" شازیہ بولی۔

"شیر خرمہ نوری بنالائیں گی۔" امی نے کہا۔

"کشور نے کہا تھا کہ میں مرغی روسٹ کرلاؤں گی۔" ابو بولے۔

"تو پھر کام ہی کیا رہ گیا؟" فراز نے کہا۔

"گھر کی صفائی بھی تو۔" فریحہ نے کہا۔

"ارے ہاں شاہین سے کہنا ہے کہ وہ پان نہ بھولیں" امی نے زور دیا۔

امی میں نے تو اپنی شیروانی اور کپڑوں پر استری کردی ہے۔" فواد نے کہا۔

"لو بھئی آج کی نماز ہی گئی مغرب کی۔"

اچانک دروازے کی گھنٹی بجی' جس نے سب کو چونکا دیا۔

فواد نے دوڑ کر دروازہ کھولا۔ چچا جان آگئے چچا جان آگئے امی۔

"بھائی جان بھابھی السلام علیکم"

"ارے بھئی طارق تم اس وقت کیسے What a Surprise"

ابو نے اٹھ کر ہاتھ ملایا "اور پروین کہاں ہیں؟" امی نے پوچھا۔

"بھابھی جان آپ تو جانتی ہیں' ان کو غرارہ پہننے کا شوق ہے اگر وہ غرارہ نہ پہنیں اور اگر سر میں گلاب کا پھول نہ لگائیں تو ان کی عید کیسے ہوگی؟ میں نے کہا چلو بولیں مجھے اپنے غرارہ پر گھنگھرو لگانے ہیں۔ بس وہ شام سے لئے بیٹھی تھیں۔"

"اور کیسے ہو آؤ یہ فالودہ پیو" امی نے بات کا رخ بدلا۔

"بھابھی جان ٹھیک ہوں' میں تو ایک خوشخبری سنانے چلا آیا ہوں' میں نے لاٹری جیت لی ہے۔" "اچھا مبارک مبارک" سب نے ایک زبان ہو کر کہا۔ انہوں نے جیب سے ایک تراشہ اور ایک خط نکالا' یہ لیجئے میں نے برطانیہ کی ایک پونڈ والی لاٹری نہیں۔

"تو پھر.....؟" ابو بولے۔

"ارے بھئی قطع کلام ہوتا ہے سنئے مجھے اپنی کتاب پر انعام ملا ہے اردو کے بہترین افسانہ نگار ہونے کا۔" کونسی کتاب جو ابھی آئی ہے۔ "ستاروں کے دکھ"

جی ہاں نوبل پرائز یورپ کا پہلا اردو نثر نگار ہوں۔

"ارے ہاں تم نے اس کا انگریزی میں ترجمہ بھی تو کیا ہے نا۔" ابو نے سوچ کر کہا۔

جی ہاں بھائی جان۔

"کیا ملا آپ کو" فراز نے دلچسپی لی۔

مجھے انہوں نے دس ہزار پونڈ انعام دیا ہے اور بروقت اطلاع ملی ہے کل عید ہے نا شاید۔

"اس میں سے چار ہزار پونڈ میں ان بچوں کو دینا چاہتا ہوں لیکن ایک شرط ہے، جس نے پورے روزے رکھے ہیں" طارق بولے۔

"فی بچہ ایک ایک ہزار؟" امی نے کہا۔

"ارے بھئی یہ تو بہت ہے" ابو نے جملہ پورا کیا۔

"ان کی قسمت بھی تو شامل ہے" طارق چچا نے کہا۔

"میرے خیال میں بس سو سو پونڈ دے دو اور باقی اپنے لئے..... " امی نے زور دیا۔

نہیں بھابھی آپ اپنی رائے نہ دیں' یہ میرا فیصلہ ہے' ہاں بھئی فواد کتنے روزے رکھے؟

جی میرے پورے روزے اور فریحہ شازیہ تم نے پورے ایک دم آج تک اور ہاں قرآن شریف بھی ختم کیا ہے دونوں ایک دم خوشی سے چیخیں اور اچھل پڑیں اور تم فراز تم نے کتنے رکھے؟

"ایک بھی نہیں رکھا" ابو نے بات کا جواب جیسے فراز سے چھین لیا۔

"یہ تو عید اور روزے کو مانتے ہی نہیں چچا جان" فواد نے کہا۔

"ان کو ابھی پارٹی میں جانا ہے' ان کو جانے دو دیر ہو جائے گی طارق!" ابو بولے۔

"نہیں نا...!!..... ابو! میں پارٹی میں نہیں جا رہا میں کل سے روزہ رکھوں گا چچا جان"

"مگر کل تو عید ہے یار!" طارق نے فراز سے کہا۔

تو پھر میری عیدی؟ فراز کے چہرہ پر اداسی کی گھٹا چھا گئی۔

"عیدی تو اس کو ملے گی جناب جس نے روزے رکھے۔" ابو نے ایک قہقہہ لگایا۔

"اب بیٹے تم؟" امی نے اداس لہجہ میں کہا۔

"پارٹی پر جایئے بھائی جان" فواد' فریحہ اور شازیہ نے جملہ پورا کیا۔

"Oh God میری عیدی....." فراز نے ہاتھوں میں منہ چھپا لیا..... یہ پچھتاوا۔

ایک چیلنج

گھر میں سب بہنوں سے بڑی ہونے کے سبب مجھ میں احساس ذمہ داری بھی بہت تھا۔ اماں کو تو ہمیشہ ہی بیمار دیکھا' اس لئے گھریلو کاموں میں بھی ان کا ہاتھ بٹاتی۔ گھر کا کونسا ایسا کام نہ تھا جو مجھے نہ آتا ہو۔ ہر وقت گھر سنبھالتے سنبھالتے سگھڑپن بھی میری دوسری عادت بن گئی تھی۔ ابا کو وقت پر کھانا دینا' ان کا بٹوہ بھرنا' بہنوں کو تیار کرنا' بس۔ اماں بھی بے فکر رہتی لیکن کبھی کبھی پڑوس سے آنے جانے والیوں سے یہ ضرور تذکرہ کرتیں "میری بیٹی بہت نیک اور فرمانبردار ہے' خدا اس کو سسرال اچھی دے۔" ابا بھی بڑی دعائیں دیا کرتے۔ چھوٹی سی تھی جب سے ہی ہنڑکلیا پکانا اور گڑیا کھیلنا' ان کے کپڑے سینا میرا مشغلہ تھا۔ ابا کی ضد پر اسکول میں داخلہ لیا لیکن چھ سات جماعتوں سے زیادہ نہ پڑھا سکے کیونکہ پھر چھوٹے بھائی بہنوں کو کون دیکھتا۔ ریحانہ' فرزانہ بھی بڑی ہو رہی تھیں اور منا جو گھر میں ہم سب کا لاڈلا تھا۔ اس کی دیکھ بھال بھی میرے ہی ذمہ تھی۔ اسے وقت پر اسکول بھیجنا' کپڑوں پر استری کرنا' یہ سب کام کر کے مجھے بہت مزہ بھی آتا تھا۔ شام کو گھر میں بڑی رونق ہوتی۔ سب ساتھ کھانا کھاتے' ابا لطیفے سناتے اور پھر باری باری ہم لوگوں سے کہا جاتا ایک شعر اور ایک لطیفہ تازہ روز سب کو سنانا ہوتا۔ اماں کو شاعری سے دلچسپی تھی۔ وہ اکثر باتوں باتوں میں بھی کوئی نہ کوئی شعر سنا دیا کرتیں۔ ہم لوگ مفلوک الحال تو نہیں تھے لیکن امیر بھی نہیں تھے۔ دھیرے دھیرے ہم سب جوان ہو رہے تھے۔ کبھی کبھی ابا کو میں دیکھا کرتی کہ وہ خلاؤں میں کھو جاتے۔ میں پوچھتی "ابا کیا بات ہے؟" "کچھ نہیں کچھ نہیں پھر کہتے تمہاری ماں کی زندگی کی دعا مانگ رہا ہوں" کیونکہ وہ دن بدن کمزور ہوتی جارہی تھیں مگر ہمیشہ مسکراتی رہتیں اور یہ ہی رویہ ہم سب نے ان سے سیکھا تھا۔ ایک دوسرے کو چھیڑنا' بات بات پر ہنسنا۔ ابا اکثر شام کو دفتر سے واپسی پر کبھی تربوز' کبھی خربوزے اور کبھی آم لایا کرتے۔ جب بھی کسی پھل کا موسم آتا ہمارے گھر میں وہ سب سے پہلے کھائے جاتے۔ ہمارا چھوٹا سا سنسار تھا' جس میں رسالے'

کتابیں' اخبار' ریڈیو' ٹی وی پر بھی باتیں ہوتیں' سب کی کوشش ہوتی کہ کوئی نہ کوئی پہلے نئی خبر سنا دے۔ سردیوں میں مولی اور شلجم کا اچار ہوتا۔ اماں نے مجھے اچار ڈالنا بھی سکھا دیا تھا کہ بیٹا گھرداری کے لئے اور شوہر کو خوش رکھنے کے لئے عورت کو مزیدار کھانے پکانا ضرور آنا چاہئیں۔ میں سب کچھ شوق سے سیکھتی۔ شب برات کا حلوا ہو یا عید پر شیر خرما یا محرم پر حلیم پکانا کیا تھا جو اماں نے مجھے نہیں سکھایا تھا۔ خاندان والے بلکہ دادی اماں تو جب بھی آتیں کہتے "ارے بٹیا تم پوری خانساماں ہوگئی ہو" یہ ننھی نے ابھی سے اتنی چھوٹی سی لڑکی کو گھرداری میں ڈال رکھا ہے' پھر خود ہی منہ لٹکا کر کہتیں "غریب ڈرتی ہیں کہ کہیں آنکھ نہ بند ہو جائے تو بڑی بیٹی کو سب کچھ سکھا دوں" اور میں فوراً دادی اماں کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا کرتی خدا نہ کرے۔ وہ بھی آپ کی طرح پوتے پوتیاں دیکھیں گی۔ لڑکیاں تو بڑھتی ہی گاجر مولی کی طرح ہیں۔ اب دن گزر رہے تھے' ہم لوگ بڑے ہو رہے تھے۔

ریحانہ اور فرزانہ تو بالکل گڑیاں لگتی تھیں۔ ادھر منا بھی جوان ہو رہا تھا۔ اب گھر میں رشتے آنا شروع ہوگئے۔ کبھی چوڑی والی ریحانہ کا رشتہ لاتی تو کبھی دھوبن فرزانہ کے رشتے کی بات کرتی۔ اماں ہنس کر ٹال دیا کرتیں کہ ابھی تو ہم بڑی کا رشتہ دیکھ رہے ہیں۔ اس کے لئے دیکھو پہلے تو ہر طرف سے جواب ملتا "بیٹا آج کل تو لوگ پیسہ دیکھتے ہیں یا پھر تعلیم اگر لڑکی بہت خوبصورت ہو تو پھر تعلیم کی پروا نہیں کرتے مگر رخسانہ بی بی کے لئے کوئی امیرزادہ یا شہزادہ ملنا تو مشکل ہی ہے۔ کہیں مناسب رشتہ دیکھا تو بتائیں گے۔" یہ باتیں سن کر پہلے تو میں ہنس کر ٹال دیا کرتی لیکن جب ریحانہ' فرزانہ کے رشتے دھڑا دھڑ آنے شروع ہوئے تو میری پریشانی بھی بڑھی اور ابا بھی گہری سوچ میں نظر آنے لگے۔ جو بھی آتا وہ یا تو ریحانہ کا رشتہ مانگتا یا پھر فرزانہ پر نظر کرتا۔ میرے بالوں میں چاندی کے تار آنا شروع ہوگئے۔ ابا کے بال بھی سفید ہوتے جا رہے تھے۔ ابا بھی یہ کہہ کہہ کر تنگ آگئے تھے کہ ہم پہلے بڑی بیٹی کی شادی کریں گے۔ کبھی ریحانہ کی پڑھائی کا بہانہ' کبھی فرزانہ کے میڈیکل کورس کے مکمل کرنے کا عذر مگر وقت کہاں رکتا ہے' وہ تو آبشار کی رفتار سے بھی آگے نکل جاتا ہے۔ میرے بھی کان پکنے لگے اور دھیرے دھیرے میرے دل میں اداسی کی جڑیں پھیلنے لگیں۔ جب ابا نے میری جوانی کی شاخ کے زرد پتے بکھرتے دیکھے تو وہ اور بھی اداس اور خاموش رہنے لگے۔ اماں کو حلق کا کینسر ڈاکٹر نے بتایا' ادھر ان کی بیماری ادھر ابا کی پریشانی۔ آخر ایک دن میں نے بڑی ہمت کی اور آکر اماں سے کہا کہ "ابا سے کہئے کہ جس کا بھی مناسب رشتہ پہلے آئے' اس کی

ذمہ داری سے سبکدوش ہو جائیں۔" امی کی آنکھوں میں نمی تھی مگر انہوں نے مجھے مسکرا کر پیشانی پر بوسہ دیا۔ "اللہ تجھے ضرور اس کا اجر دے گا۔" یہ بات تھی بھی ویسے مناسب۔ اماں ابا کی سمجھ میں آنے لگی۔ انہوں نے فرزانہ کے ہاتھ پیلے کر دیئے اور وہ شہزادہ اپنی دلہن کو لے گیا۔

دو سال بعد ہمارے خالہ زاد بھائی منصور امریکہ سے آئے ہمارے گھر میں جب انہوں نے ریحانہ کو دیکھا تو بس نچھاور آگے پیچھے اور خالہ جان کو لے کر ہاتھ میں مٹھائی کا ڈبہ۔ چھٹی پر آئے تھے بلکہ شادی ہی کی نیت سے وہ بھی پری کو لے کر پرستان یہ جا وہ جا۔ بس اب گھر میں منا تھا اور میں تھی۔ منا تو ابھی فرسٹ ایئر میں کالج میں تھا لیکن میں تو اب شادی کی عمر سے بھی تجاوز کر رہی تھی۔ ابا کو یہ فکر ہر وقت لاحق رہتی لیکن کہیں سے دور دور کوئی امید نظر نہ آتی۔ لڑکوں کی مائیں محفلوں میں کہتی نظر آتیں کہ لڑکی خوبصورت ہو' جہیز میں یہ ہو وہ ہو۔ اگر لڑکی پڑھی لکھی ہو تو وہ بھی اچھا ہے اور اگر کوئی لڑکا باہر سے آتا تو اس کی تو مانگ اور بھی زیادہ۔ ماں کہتی کہ ہم کو نقد دے دیں 'جہیز نہیں چاہئے۔ بس یہ باتیں سن کر ابا تو بالکل ہی مایوس ہو چکے تھے۔ اماں تو خیر کسی دن بھی ہم سے جدا ہونے والی تھیں۔ ان کا حلق کا کینسر باوجود آپریشن کے قابو سے نکلا جا رہا تھا۔ ابا ذہنی کینسر کا شکار ہوتے جا رہے تھے۔

ایک دن منے نے آ کر یہ عقدہ سنایا کہ وہ پڑھائی چھوڑ کر دبئی جا رہا ہے' اس کا ایک دوست اس کو دعوت دے رہا ہے۔ شہر کے حالات دیکھ کر ابا نے خاموشی سے اجازت دے دی۔ بھیا چلے پردیس' اماں تو دوسرے ہی پردیس کی ڈولی میں بیٹھنے والی تھیں۔ بس بھیا کا جانا ادھر اماں کا دل ٹوٹنا۔ پھر نفسیاتی اثر بھی بیمار کے لئے جلتے پر تیل کا کام کرتا ہے۔ اماں بھی سدھاریں اب ابا تھے اور میں۔

رشتے داروں نے آ کر اور دباؤ ڈالنا شروع کیا کہ لڑکی کے فرض سے سبکدوش ہوں اور کہیں نکاح کر لیں۔ ابا بیچارے امی کی جدائی ادھر بڑھاپے کی کمزوری۔ بس ضعف سے چڑ چڑے بھی رہنے لگے۔ مجھے اپنا بوجھ خود ہی بھاری لگنے لگا۔ پھر ابا میری وجہ سے باہر نہیں نکلتے کہ جوان لڑکی گھر میں اکیلی کیسے رہے گی۔ اگر مرد نوکر رکھتے ہیں تو مشکل عورت رکھیں تو یہ ڈر کہ لوگ کیا کہیں گے بس میں ان کے لئے سانپ کے منہ میں **چھچھوندر** سی ہو گئی تھی۔ میرا زیادہ وقت باورچی خانے میں صرف ہونے لگا۔ برتن دھونے اور رکابیاں چمکانے میں' ماہر فن ہوتی جا رہی تھی۔ ایک روز میں نے اخبار میں خبر پڑھی کہ پچپن سال مطلقہ برٹش نیشنل

کے لئے تیس سے پینتیس سال تک کی خوش مزاج نیک سیرت لڑکی کی ضرورت ہے۔ رشتے کے خواہش مند پوری تفصیلات ایک ہفتے کے اندر اندر روانہ کردیں۔ لڑکے کو واپس جانا ہے اور بیوی کو ساتھ لے کر جائے گا۔ میں نے فوراً ابا کی طرف سے خط لکھ دیا کہ وہ رابطہ کرے۔ بس وہ تو جیسے منتظر ہی تھا۔

وہ ہمارے گھر اپنے کسی دوست کے ساتھ آیا۔ اس نے اپنے خاندان اور اپنے بارے میں ابا کو بتایا۔ دیکھنے میں ٹھیک ٹھاک۔ چائے ناشتہ لگا دیا گیا۔ ابا نے مجھے بھی بلا لیا اور کہا کہ آپ لوگ آپس میں بھی بات چیت کر سکتے ہیں۔ دو چار مرتبہ وہ صاحب تشریف لائے اور ملاقاتیں بڑھیں لیکن انہوں نے باتوں باتوں میں مجھے بتایا کہ ان کی بیوی موجود ہے مگر اس کے کوئی بچہ نہیں ہے۔ وہ ہر صورت میں اس کو چھوڑنا چاہتے ہیں۔ ان کی بنتی نہیں ہے۔ پہلے ابا کو یہ بات بالکل پسند نہیں آئی لیکن جب انہوں نے زور دیا اور کہا کہ "میں ایسا ظلم نہیں کروں گا کہ ایک کی موجودگی میں دوسری لاؤں۔ یہ دونوں پر ظلم ہے" باتوں سے وہ بہت معقول نظر آتا تھا۔ ابا نے کہا کہ اگر آپ طلاق نامہ لے آئیں تو ہم ضرور غور کریں گے مگر ابا سے میں نے انکار کر دیا کہ یہ کوئی چال نہ ہو۔ اس سے میں دو چار مرتبہ ضرور ملوں گی۔ چونکہ ابا تو مجھے سیل پر لگائے بیٹھے تھے کہ بس اونے پونے داموں میں بیچ کر اپنی دکان بند کریں۔ گویا closing down sale کی آخری بکری میں ہوں۔ ادھر وہ صاحب بھی بہت بے چین تھے کہ شریمتی کی ضرورت کا اشتہار بنے ہوئے تھے۔

میں نے تنہائی میں ان سے پوچھا کہ اپنی بیوی کو چھوڑنے کی کوئی معقول وجہ مجھے بتایئے۔ چلئے تو سنئے وہ مجھے سارے میں بدنام کرتی ہیں کہ میں اولاد پیدا کرنے کے لائق نہیں ہوں اور میں ان کو یہ ثابت کرنا چاہتا ہوں۔ میں آپ کو یہ بھی بتادوں کہ میں اس عورت سے بہت محبت کرتا ہوں لیکن میری انا کو اور مردانگی کو وہ عورت چیلنج کر رہی ہے۔

اگر دوسری شادی سے بھی بچہ نہ ہوا تو پھر آپ ایک دوسری عورت کی زندگی سے کھیلنا چاہتے ہیں' میں چکرا گئی۔

اب آپ جو بھی سمجھ لیں۔ میں نے تو طے کیا ہے کہ میں اس عورت کو مزہ چکھاؤں گا' یہاں نہیں تو کہیں اور۔

مجھے ایسا لگا کہ یہ خریدار اگر ہماری دکان سے سودا نہیں لے گا تو کہیں اور سے لے گا۔ میں نے سوچا میں بھی تو تنگ آچکی تھی اس کشمکش زندگی سے۔ چلو جوا کھیل ہی لو۔ پھر میں نے

کہا کہ اس عورت کی آہ لگ جائے گی آپ کو اور ساتھ مجھے بھی جلا ڈالے گی۔ اس نے کہا نہیں آپ سوچ لیں۔

ابا نے بھی فیصلہ مجھ پر چھوڑ دیا۔ میں نے کہا ٹھیک ہے آپ جب طلاق نامہ لے آئیں گے 'میں تیار ہوں پھر۔

ہمارا نکاح "آناً" "فاناً" ہو گیا۔ شادی سادگی سے ہو گئی۔ میں زندگی کے نئے سفر پر گامزن تھی۔ ہوائی جہاز مجھے ایسی منزل پر اڑا رہا تھا کہ سوائے بادلوں کے مجھے کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ نیا ملک 'لندن دیکھنے کی آرزو نے تھوڑا سا دل کو بہلائے رکھا تھا۔ سارے راستے وہ شخص میری خاطر و مدارات کرتا رہا۔ اس کے چہرہ پر ایک فاتحانہ تاثر تھا اور یہ میرے خواب کی تعبیر تھی۔ مجھے اس نے دو چار روز تو خوب سیر کرائی۔ گھر نہیں تھا ایک فلیٹ تھا جس کا ایک کمرہ بند تھا جیسے کہانیوں میں ہوتا ہے کہ چوتھے کھوٹ نہیں جانا ہے۔ بار بار میرا جی چاہتا کہ اس کمرہ کو کھول کر دیکھوں کہ اس میں کیا ہے۔ لیکن سہیل مجھے ٹال دیتے۔ ابا نے چلتے وقت نصیحت کی تھی کہ بیٹی اس گھر سے تمہاری ڈولی جا رہی ہے 'اب وہاں سے تم مر کر ہی نکلنا۔ دیر آید درست آید۔ لڑکا شریف ہے مجھے تم سے امید ہے کہ تم ایک فرماں بردار بیوی بنو گی کیونکہ تم ایک مشرقی لڑکی ہو۔ جانے کیا کیا ابا نے کانوں میں ڈالا تھا۔ ہماری تمنا پوری ہو گئی تمہاری ماں کی روح کو بھی قرار آگیا ہو گا۔ مرتے وقت تمہاری فکر تھی ان کو۔

یہاں یہ عالم کہ شادی ہوتے ہی میں حاملہ ہو گئی۔ سہیل کا خوشی کے مارے عجیب حال جیسے ورلڈ کپ کسی ملک نے جیت لیا ہو۔ کبھی مچھلی لئے چلے آرہے ہیں اور کبھی پھل 'بے حد خیال میرا۔ ثمن مچھلی کھاؤ بچے ذہین ہوتے ہیں۔ کبھی کلیجی کہ اس میں آئرن ہوتا ہے لیکن اکثر شام کو وہ دیر سے آتے۔ اور وہ کمرہ میرے لئے پراسرار کبھی نہ کھلتا۔ اکثر سہیل مجھے کہتا "دیکھا وہ مجھے نامرد کہتی تھی 'اب پتہ چلا اس کو۔ مجھے ہر وقت یہ ہی طعنہ دیتی تھی۔ دن میں دو چار مرتبہ ضرور 'وہ ثمینہ کو یاد کرتا۔ کبھی کہتا تم بھی سبز رنگ پہنا کرو 'وہ سبز رنگ پہنا کرتی تھی۔" کبھی کہتا "تم شامی کباب بنا تو لیتی ہو لیکن ویسے نہیں کوشش کرو۔ اور ہاں تھوڑا سا اپنے کو دبلا کر لو وہ بہت نازک سی تھی۔" کبھی میرے لئے پرفیوم لاتا "لو یہ پرفیوم لگاؤ یہ اسے بھی پسند تھا۔" اور میں ثمینہ بننے کی کوشش میں ہر وہ کام کرتی 'جس کی سہیل فرمائش کرتا۔ کپڑوں کے رنگ لپ اسٹک کے شیڈ 'خوشبو ہر چیز وہ مجھے وہی لا کر دیتا جیسی ثمینہ کے پاس ہوتی تھی۔

ایک دن میں نے جھلا کر کہہ دیا کہ میں ثمینہ نہیں ہوں' میں رخسانہ ہوں۔ آپ ہوش میں آئیں کیونکہ کبھی کبھی وہ لاشعوری طور پر مجھے ثمینہ کہہ کر مخاطب بھی کرتا۔

وہ دھیرے دھیرے دیر سے آنے لگا اور کبھی کبھی اس کے منہ سے شراب کے بھبھکے آتے۔ ایک دن میں نے ضد کرکے پوچھا کہ اس کمرے میں کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ جب ہمارا بچہ ہوگا تب اس کو کھولیں گے' اس کا افتتاح کریں گے۔ اچھا میں نے ٹال دیا۔ اب ہمارے یہاں منا آچکا تھا۔ سہیل کی شراب کی عادت نہ چھوٹی بلکہ وہ بڑھتی چلی گئی۔ نوکری سے بھی نکال دیئے گئے۔ میں ابا کو بھی یہ نہیں لکھتی اکثر ان کے دوست بتاتے کہ یہ ہمارے پاس بوتل لئے بیٹھے ہوتے ہیں۔ پہلے تو میں ان کے دکھ درد میں شریک رہا کرتی لیکن ان کی نشے کی عادت بڑھتی گئی۔ سسرال والوں کو معلوم ہوتا تو وہ خط میں لکھتے اگر بیوی چاہے تو شراب اور سگریٹ چھڑا سکتی ہے لیکن میں تو ایک کمزور زمانے کی ٹھکرائی ہوئی عورت تھی جسے اس مرد نے سہارا دیا تھا۔ ایک دن میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اس کمرہ میں لے گئے۔ لو دیکھو یہ وہ کمرہ کھلا جس میں بوتلیں اور گلاس ٹوٹے ہوئے تھے اور سامنے فریم میں بے شمار ثمینہ کی تصویریں لگی تھیں۔ انہوں نے کہا دیکھو ثمینہ یہ بچہ دیکھو میں نامرد نہیں ہوں۔ میں خاموشی سے سر جھکائے چلی آئی۔ وہ اکثر جا کر اس کمرے میں بیٹھ جاتے۔ گھنٹوں سگریٹ کے دھوئیں میں ثمینہ کی تصویروں سے باتیں کیا کرتے۔ وہ ثمینہ کو اپنے دل سے نہ نکال سکے اور ہمارے یہاں دوسرا بیٹا بھی پیدا ہوگیا۔ میں ایک کٹھ پتلی تھی جس کو بچپن سے دھن میں لگی رہنے کی عادت تھی۔ سہیل کو نہ گھر میں دلچسپی تھی نہ بچوں سے۔

کبھی کبھی موڈ میں آکر کہتا "تم ثمینہ نہیں بن سکتیں" اور پھر کہتے "تم کو ایک شوہر کی تلاش تھی اس نے تم کو شوہر دے دیا' تمہارے ماں باپ کا بوجھ ہلکا ہوگیا اور میں ثمینہ کے سامنے سر اٹھانے کے قابل ہوگیا شکریہ رخسانہ شکریہ" اور پھر بلک بلک کر بچوں کی طرح روتا۔ میں اس کو گلے سے لگاتی لیکن شراب اور ثمینہ تو اس کی رگ رگ میں بس چکی تھی۔

کچھ عرصہ کے بعد معلوم ہوا کہ ثمینہ نے بھی دوسری شادی کرلی ہے۔ اور ایک دن خبر آئی کہ ثمینہ کے گھر بیٹی پیدا ہوئی ہے۔ یہ خبر سہیل کے دوست نے اس کو دی۔ وہ گھر آکر خوب چیخا۔ تم نے میری ثمینہ مجھ سے چھین لی' وہ بھی اس لائق تھی بانجھ نہیں تھی میں تمہارے باپ کی باتوں میں آگیا اور اس کو طلاق دے دی۔ اف یہ کیا ہوا۔ اب تو سہیل کی شراب نے سہیل کے ہوش و حواس بھی چھین لئے۔ وہ مجھے گالم گلوچ سے نوازنے لگا۔ مجھے

اور میرے باپ کو برا بھلا کہتا۔ میں سوچا کرتی کہ میں اس سے تو کنواری بھلی تھی۔ لیکن اپنے دو پھول سے بچوں کو دیکھ کر آنسو پونچھ لیا کرتی۔ ایک دن میں نے غصے میں اس کو گھر سے باہر نکال دیا۔ وہ سڑکوں پر مارا مارا پھرتا' جانے رات کہاں گزارتا۔ پھر معلوم ہوا کہ حکومت نے اس کو ہوم لیس سمجھ کر فلیٹ دے دیا۔ وہ اکثر نیچے چکر لگاتا پکار پکار مجھے گالیاں دیتا۔ لوگ کھڑکیوں سے سر نکال کر اس کا تماشا دیکھتے۔ اور پھر کہتا تیرے باپ نے مجھ سے زبردستی کی تو نے مجھ سے ثمینہ کو چھین لیا اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا۔ میں پریشان ہو جاتی مگر بچے مجھے منع کرتے کہ یہ شرابی ہیں آپ کو مار دیں گے قریب نہ جایئے گا۔ شراب نے اس کا جگر اور لیور بالکل خراب کر دیا تھا۔ پتہ چلا کہ وہ ہسپتال میں پڑا ہے۔ ہم لوگ ہمت کر کے ہسپتال پہنچے' وہاں بھی مجھے دیکھتے ہی اس نے پھل اور پھول جو ہم لے گئے تھے' زمین پر دے مارے۔ اور کہا "تم نے مجھ سے ثمینہ کو چھین لیا اور میں اب اپنے آپ کو تم سے چھینتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے وہ گلدان اپنے سر پر دے مارا۔ اچانک نرسیں دوڑ کے آئیں' ناک سے خون بہہ رہا تھا اور وہ آخری سانس لے رہا تھا۔ دھڑام سے بستر سے گرا اور جان آفریں کے سپرد کی۔ میں گھر آئی' میں نے سجدے میں پڑ کر خدا سے دعا کی "اے خدا مجھے قید بامشقت سے چھٹکارا ملا۔ اللہ مجھے ہمت دے کہ ان دو پھول سے بچوں کو پال سکوں۔ پھر اٹھ کر دو فون کئے کہ ابا" جس طرح مجھے رخصت کر کے آپ نے سکون کی سانس لی تھی۔ آج سہیل کو دنیا سے رخصت کر کے مجھے بھی ایسا لگا جیسے میری بیٹی کی بارات گئی ہے اور ایک فون ثمینہ کو کیا۔ سہیل کی آخری سانسوں پر تمہارا حق ہے' وہ وہاں بھی تمہارا انتظار کر رہا ہوگا۔ وہ صرف تمہارا تھا تمہارا اپنا میرا کبھی نہیں ہو سکا۔ رہا تمہارا چیلنج تو وہ جیت گیا اور تم ہاں تم ہار گئی۔

ڈاکٹر کی فیس

میں گورنمنٹ کالج میں انگلش کی لیکچرار تھی۔ آج حسب معمول تھرڈایئر کو میں رومیو جولیٹ ڈرامہ پڑھانے میں سراپا مگن تھی۔ کلاس کی لڑکیاں اس قدر توجہ سے یہ جذباتی ڈرامہ سن رہی تھیں رومیو فلورنس کے ذریعے خط دیتا ہے کہ وہ یہ پروانہ ملتے ہی اس ڈرامہ پر عمل کرے۔ اس جوشیلے تخیل کی رنگینی میں پوری کلاس محو تھی اور میں جب بھی شیکسپئر کو پڑھاتی تو پوری طلسمی فضا پیدا کردیتی' اسی لئے لڑکیوں کو اس کی کلاس کا بے چینی سے انتظار رہتا۔ ہرلڑکی اپنے آپ کو جولیٹ کے کردار سے ہم آہنگ کرلیا کرتی تھی۔ یہ ماحول بن ہی رہا تھا کہ اچانک دروازہ کھلا اور مالتی نے جو اس کالج کی ایک پرانی چپراسن تھی زوردار اور گھبرائی ہوئی آواز میں کہا "مس آپ کو مسٹر گولن دفتر میں بلا رہے ہیں۔ آپ کا ضروری فون آیا ہے' فوراً" چلئے۔" اس کی آواز ایک توپ کا دھماکا بن کر میرے سر پر گری۔ میں نے فوراً" کتاب بند کی اور رضیہ سے جو کلاس مانیٹر تھی کہا "ذرا خیال رکھنا شور نہ ہو میں ابھی آئی" اور کلاس سے مخاطب ہو کر کہا "تم لوگ خاموشی سے دوسرا لیسن پڑھو میں آتی ہوں اور ہاں مسزبارکلے کو نہ پتہ چلے ورنہ وہ فوراً" آکر تم لوگوں کو ڈانٹ وپھٹکار کریں گی" یہ کہتی ہوئی میں کلاس سے باہر نکل گئی' پیچھے پیچھے مالتی بھی ہولی۔

"کیا بات ہے مسٹر گولن!" "دیکھئے آپ کا فون ہے اٹھایئے" "جی ہیلو دوسری طرف بھائی جان بول رہے تھے۔ "منی تم کو معلوم ہے ناجمی کی طبیعت خراب تھی سنبھل گیا تھا۔ ابھی تمہاری بھابھی جان کا فون آیا ہے' اس کی حالت بگڑ گئی ہے' میں بہت پریشان ہوں۔ فرید آباد دور ہے' بسوں کے دھکے کھاتا ہوا گھر کب پہنچوں گا' میری جیب میں تو بس ایک پانچ کا نوٹ پڑا ہے۔ کیا ممکن ہے کہ تم فوراً" آجاؤ' میرے تو ہوش ہی ٹھکانے نہیں۔" "میں ابھی آئی آپ فکر نہ کریں۔ میرے پاس پیسے ہیں' راستے میں بینک سے نکال لوں گی۔ بس ابھی پہنچی" یہ کہہ کر میں نے فون رکھ دیا۔ "گولن صاحب میرے بھتیجے' جمی کی حالت بہت خراب ہے' مجھے

ابھی جانا ہے' آپ مسز بارکلے سے بتا دیجئے گا۔" اس کے چہرے کے تاثرات نے بھی بہت کچھ پیغام مسٹر گولن کو دے دیا تھا اور وہ ٹیکسی لے کر بھائی جان کے دفتر پہنچ گئی۔ نادیہ کے اسکول سے بھائی جان کا دفتر قریب ہی تھا۔ بھائی جان نیچے کھڑے تھے۔ "ارے منی مجھے معلوم تھا کہ تم فوراً" آجاؤ گی بس چلو۔ ڈرائیور چلو فرید آباد جلدی پہنچادو' مریض کو لانا ہے۔"
"مریض کیا میرا بچہ ہے' بیمار ہے" بھائی جان گھبرایئے نہیں جمی ٹھیک ہو جائے گا۔ نادیہ تم جانتی ہو میری امیدوں کا سہارا ہے۔ اتنا ذہین اور ہونہار ہے۔ ڈھارس رکھئے علاج ہو گا بس۔ بھائی جان کے چہرہ پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں' بدحواسی میں جانے کیا کیا کہہ رہے تھے۔ "صبح تو ٹھیک تھا۔ وہ دراصل کل باہر جا کر نل کے نیچے نہالیا' ستارہ اس کو روکتی رہی مگر وہ مانا نہیں کہنے لگا "ٹھیک ہوں۔" نل کا ٹھنڈا پانی..... جانے کیسا ہو گا جمی۔ ڈرائیور ذرا رفتار تیز کردو۔ تمہاری بھابھی جان کافی بہادر ہیں لیکن فون پر ان کی آواز میں گھبراہٹ تھی۔ ایسی جھنجھناہٹ جو میرے دل کے تاروں کو چھو گئی۔" بھائی جان بولے جارہے تھے اور میں بار بار ان کا ہاتھ پکڑ لیتی۔ "حوصلہ رکھئے' ٹھیک ہو گا۔ ہم لوگ گھر پہنچ گئے۔ گھنٹی بجائی' بھابھی جان فوراً" دروازے پر آئیں "اسے فوراً" ہسپتال لے چلئے' دیکھئے بری حالت ہے اس کی۔" اس کو پکڑ کر گاڑی میں بٹھایا' راستے میں میں نے کہا "نہیں یہ ہسپتال نہیں جائے گا۔" ارے بھئی اس کو جناح ہسپتال لے چلو' وہ قریب ہے۔" "نہیں یہ وہاں نہیں جائے گا" میں نے زور دیا کہا" سول ہسپتال" "سول ہسپتال تو بہت دور ہے منی۔" بھابھی جان اس کو ڈاکٹر حلیم کو دکھائیں گے' ان کے ہاتھ میں شفا ہے۔ وہ برنس روڈ پر جو ہیں نا۔ ماموں جان کے فیملی ڈاکٹر ہیں۔" "نہیں بھئی وہ تو ڈاکو ہے ڈاکو۔ ہمارے پاس اتنی فیس کہاں' بہت بھاری فیس لیتا ہے ڈاکٹر حلیم۔" "بھابھی جان فکر نہ کیجئے' بینک سے پیسے نکلوا لیئے ہیں۔" بھابھی جان نے ہتھیار ڈال دیئے اور اس کو لے کر ڈاکٹر حلیم کی ڈسپنسری پہنچے انہوں نے فوراً" اس کو دیکھا۔ **انجیکشن** لگایا اور نسخہ لکھا۔ گو بھاری فیس بھی وصول کی۔ ہم لوگوں نے راستے سے دوالی اور جمی کو لے کر گھر پہنچے۔ اماں نے پہلے ہی بستر تیار رکھا تھا اور وہاں جمی کو لے جا کر لٹا دیا گیا۔ ابا بھی پریشان بدحواس تھے۔ جمی سارے گھر میں لاڈلا تھا۔ اس کی ذہانت اور سمجھداری سے سب ہی لوگ اس سے پیار کرتے تھے۔ وہ جب بھی چھٹیوں میں ہمارے گھر آتا' ابا سے باتیں کرتا۔ کبھی محمد علی کی باکسنگ تو کبھی گاندھی جی کی نمک کی اسٹرئیک کے جنوبی افریقہ کے قصے۔ جناح کے اوپر گفت و شنید۔ ابا کا تو وہ ایک ننھا منا دوست تھا۔ روزانہ ابا اسی سے اخبار پڑھوا کر سنا

کرتے اور پھر خبروں پر باقاعدہ جائزہ لیا جاتا۔ کبھی امریکہ کے صدر تو کبھی روس کے مسائل پر بہت زور و شور سے ابا سے بحث کرتا۔ یہاں تک کہ قرۃ العین حیدر کے افسانوں اور فیض کی شاعری پر بھی اظہار رائے کرنے سے نہ چونکتا اور ابا مسکرا مسکرا کر اس کی باتیں سنتے۔ وہ ابا کو کبھی کبھی ابا دوست بھی کہا کرتا۔ یہ بات اس نے بڑے بھائی جان کے منہ سے سنی تھی' اس لئے وہ کہتا میں بھی آپ کو ابا دوست سمجھتا ہوں۔

وہ بیٹا دوست آج کمزور اور لاغر لگا تو ابا کی آنکھیں نمناک ہو گئیں۔ "آپ کے مزاج کیسے ہیں بیٹے دوست" جمی نے نقاہت سے مسکرا کر کہا "ٹھیک ہو جاؤں گا تو پھر بتاؤں گا" آج کل ہندوستان صاحب ہمارے ملک سے داؤ پیچ لڑانا چاہتے ہیں۔ "اچھا بیٹے آرام کیجئے پھر بات ہو گی۔" جمی پر نمونیہ کا سخت حملہ تھا' اس کا علاج ہو رہا تھا' پیسہ پانی کی طرح بہہ رہا تھا۔ ہمارے بھائی جان کے پاس تو دعاؤں کا سرمایہ تھا' جو وہ سجدے پر سجدے کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ اماں بھی ان کے ساتھ ساتھ سربسجود تھیں۔ بھابھی جان نرسنگ میں اپنے بچے کی پلنگ کی پٹی سے لگی بیٹھی رہتیں۔ بھائی جان کو دفتر بھی جانا ہوتا' اخبار کی ذمہ داری تھی' اداریہ بھی روزانہ لکھنا ہوتا۔ لیکن ذہنی اور دماغی طور پر ان کی جان جمی میں اٹکی ہوئی تھی۔ سارا کا سارا گھر جمی کے لئے فکر مند تھا۔ جمی نے سارے گھر والوں کے دل میں جگہ بنالی تھی۔ سب کا ہی ایک کھلونا تھا۔ وہ جب آجاتا تو اماں اس کی پسند کے کھانے تیار کرتیں۔ جمی ساری دنیا کے معاشی اور سیاسی نظام پر گفتگو کیا کرتے۔ اخبار پڑھنے سے ان کو اتنا لگاؤ تھا کہ وہ ابا کو خبریں سنانے میں پہل کرتا۔ اور پھر اس کا تجزیہ بھی کرتا۔ اماں کہا کرتیں "دلہن اس کی نظر اتار دیا کرو' یہ اپنی عمر سے اونچی باتیں کرتا ہے۔ اس عمر کے بچے تو صرف گلی ڈنڈے کی باتیں کرتے ہیں" اب اس کو بیمار دیکھ کر سب ہی ملول تھے۔

ڈاکٹر حلیم کا علاج ہوتا رہا' روپیہ پانی کی طرح بہتا رہا لیکن اس کی حالت دن بدن دگرگوں ہوتی چلی گئی۔ کبھی اوپر تو کبھی نیچے گو کہ کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا تھا' اس کے علاج کے لئے۔ بھائی صاحب پھل لئے چلے آرہے ہیں۔ دلہن بھابھی روز اس کو دیکھنے آتیں۔ کہانیاں کا مک کی کتابیں لا کر دیتیں۔ ابا باری باری آکر اس کی نبض دیکھتے۔ غرضیکہ سب کی آنکھ تارا تھا' وہ بچہ گھر میں اماں نے بھائی جان بھابھی جان کو روک لیا کہ جب تک بچہ ٹھیک نہ ہو' یہیں رہو۔ دوسری وجہ بھائی جان کی مالی حالت بھی تھی کہ علاج پر اتنا پیسہ کہاں سے خرچ کریں گے۔

اماں بھی ہر وقت دعاؤں میں مصروف۔ ابا بھی مسجد جا کر دعائیں مانگتے کہ بس جمی کسی

طرح صحتیاب ہوجائے۔ اماں نے نظر اتاری کہ شاید عمر سے زیادہ باتیں کرتا ہے۔ کبھی لال مرچوں سے اتار رہی ہیں تو کبھی سورتیں پڑھ پڑھ کر دم کر رہی ہیں۔ بھابھی جان صبر کی پتلی خاموشی سے بیٹے کی نرسنگ کرتی رہیں لیکن تیزی سے ہی اس کی حالت گر رہی تھی۔ بھابھی جان اپنا غم اندر ہی اندر چھپا رہی تھیں جیسے ماں نہیں کوئی غیر ہوں۔

اچانک ایک روز اس کی حالت خراب ہوئی کہ اس کی آواز بھی بند ہو گئی۔ شاید کومے میں چلا گیا۔ دوسرے روز صبح صبح ڈاکٹر حلیم کو بلایا گیا۔ وہ اپنا بریف کیس لئے ہوئے داخل ہوئے۔ تھرمامیٹر لگایا' انجیکشن دیا اور دوا پر اصرار کیا کہ میں نے بدل دی ویسے اماں نے ڈاکٹر خالو کو بھی بلوا لیا۔ وہ دراصل تپ دق کے ماہر تھے مگر جب بھی کسی کی حالت خراب ہوتی اماں ان کو مشورے کے لئے ضرور بلا لیا کرتیں۔ آج وہ صبح سے بیٹھے تھے اور اماں سے چپکے چپکے باتیں کر رہے تھے۔ بھائی جان باہر صحن میں جانماز بچھائے رکعتیں نماز کی ادا کر رہے تھے۔ میں بھی بھابھی جان کے برابر آکر بیٹھی' وہ سہیل کے سر پر ہاتھ پھیر رہی تھیں کہ شاید آنکھیں کھولے۔ میں نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھا۔ اس کا دل دھیرے دھیرے دھڑک رہا تھا' میرے ہاتھ کے نیچے ایک دم سناٹا چھا گیا۔ میں ڈر گئی کہ یہ سکوت کیا جانے فوراً" بھابھی جان کا ہاتھ پکڑ کر رکھا۔ انہوں نے دھیرے سے خاموشی سے میرا ہاتھ ہٹا دیا اور جمی کی آنکھیں بند کر دیں اور کہنے لگیں جاؤ اپنے بھائی جان کو بلا لاؤ اور ہاں اماں ابا کو بھی بلا دو۔ ان کے چہرے پر ایک مقدس سکون تھا' جس کا اظہار الفاظ کے بس کا روگ نہیں۔ میں بھاگتی ہوئی صحن میں آئی' جہاں بھائی جان گڑ گڑا کر خدا سے دعا کر رہے تھے۔ لیکن ان کی دعا ہار گئی اجل جیت گئی۔ وہ جمی کی روح کو دبوچ کر لے گئی ایک ماں کے ہاتھ سے چھین کر۔ میں نے بھائی جان سے کہا جلد آیئے ان کی دعا ابھی راستے ہی میں تھی لیکن جمی کی روح اس دعا سے آگے نکل چکی تھی۔

میں نے چیخ کر کہا "بھائی جلدی آیئے اب دعائیں چھوڑیئے بھابھی جان آپ کو بلا رہی ہیں۔" اماں نے کہا "بیٹا صاحبزادے روانہ ہو گئے۔ بھائی جان اور ڈاکٹر حلیم۔" میں نے کہا "وہ ابھی دو منٹ پہلے ہی نکلے ہوں گے اور کہہ کر گئے کہ یہ ٹھیک ہو جائے گا آپ فکر نہ کریں ورنہ مجھے فون کر دیجئے گا۔" بھابھی جان پٹیاں ماتھے پر رکھ رہی تھیں اور قطرہ قطرہ دوا بھی ٹپکا رہی تھیں۔

بھائی جان نے کہا "بچہ کلمہ بھی نہ پڑھ سکا' موت آکر اسے دبوچ لے گئی ہائے میرا بچہ۔"

ابا نے بھائی جان کے سر پر ہاتھ رکھا "بیٹے صبر صبر۔ کیا اس ڈاکو کو تم نے فیس دی چلتے وقت" "جی ہاں! انہوں نے مانگی تھی"

بھابھی جان خاموش پٹی سے لگی بیٹھی تھیں اور میں سوچ رہی تھی کہ عورت واقعی مرد سے زیادہ مضبوط ہوتی ہے۔ اچانک پھر بھائی جان نے ایک آواز لگائی "اور ان کی فیس ہاں دے دی۔ انہوں نے دو سو روپے مانگے' وہ کہاں گیا قصائی" بھائی جان زور سے **چیخے** "اور میرا جمی ہائے' میرا جمی" یہ کہہ وہ بے ہوش ہوگئے۔ ڈاکٹر حلیم ابھی صرف گلی کے نکڑ تک گئے ہوں گے۔ اماں نے سینے پر دو ہتڑ مارے "ہائے میرے گھر کا چراغ گل ہوگیا" بھائی جان کا سہارا' ابا کا دلارا' اماں کا لاڈلا' بھابھی جان کا چہیتا سب کو روتا دھاڑتا چھوڑ کر اس دنیا سے دور بہت دور جا چکا تھا۔ بھائی جان کو پانی ڈال کر ہوش میں لایا گیا۔ بھابھی جان ایک صبر کا خاموش پتلا بن کر کھڑی تھیں۔ ڈاکٹر خالو جو تپ دق کے ماہر ڈاکٹر تھے' جب بھی گھر میں کسی کی طبیعت خراب ہوتی اماں ان کو بلا لیا کرتیں۔ وہ اماں کے پاس دوسرے کمرے میں بیٹھے تھے جس وقت جمی جانکنی کی حالت میں تھا۔ شاید ان کو پہلے سے اندازہ تھا کہ یہ تھوڑی دیر کا مہمان ہے لیکن ڈاکٹر حلیم کو اپنی فیس کی جلدی تھی۔ وہ وقت سے پہلے ہی پھرتی سے نکل گئے کہ کہیں ان کی فیس نہ رہ جائے۔ گھر کی اداسی اور اس بچے کی کمی نے بھائی جان کو بہت کمزور کردیا۔ بھائی جان کو اس کے بعد کبھی کھل کر ہنستے ہوئے نہیں دیکھا۔ انہوں نے جمی کی ایک تصویر بہت بڑی کر کے کمرے میں لگادی ہے' جیسے ہی اس کمرے میں داخل ہو تو وہ تصویر ایکدم نظر آتی ہے۔ اب تو نہ بھائی جان ہیں' نہ اماں نہ ابا اور نہ ہی بھابھی جان مگر وہ تصویر بدستور وہیں لگی ہے اور مجھ سے کہتی ہے کہ پھوپھی جان "ڈاکٹر کی فیس دینے سے جانے والا نہیں رکتا۔" وہ فیس تو میں بھی نہیں بھول سکتی اور وہ کبھی کبھی ایک خار کی طرح چبھتی ہے بلکہ وہ ڈاکٹر بھی جس نے فیس لی تھی' اب جمی کے پاس پہنچ چکا ہے۔

دادا جان ---- عظیم انسان

حقیقت میں تو وہ میرے دادا تھے لیکن ہمیشہ انہیں ابو ہی کہا۔ ان کی شخصیت کا اثر میری ذات پر اس لئے زیادہ رہا ہے کہ امی کی موت کے بعد میری تعلیم و تربیت کی ذمہ داری انہوں نے ہی لے لی تھی۔ دادی کو بھی میں امی کہتی رہی مجھے دادا جان اور دادی جان نے کبھی یہ محسوس ہی نہیں ہونے دیا کہ میری ماں نہیں ہے۔ البتہ میں اپنے ابا کو پاپا کے نام سے پکارتی۔ ابو (دادا) اور امی (دادی) کہنے کو تو بوڑھے ہوتے جا رہے تھے لیکن میری وجہ سے اپنے کو مضبوط اور توانا رکھنے کی کوشش کرتے بلکہ اپنے کو جوان ہی سمجھتے۔ پاپا نے سب کے اصرار پر دوسری شادی کر لی تھی میں ان کو دلہن بھابھی کہتی تھی کیونکہ شازلی باجی اور نازلی باجی یعنی میری پھوپیاں ان کو دلہن بھابی کہتی تھیں۔ مجھے اپنے دادا جان اپنے دوست لگتے ہیں میں ان سے گھنٹوں باتیں کر سکتی ہوں۔ وہ میری باتیں بہت دلچسپی سے سنتے ہیں۔ میری ہر بات کا خیال رکھتے ہیں۔ دادی جان بھی کم محبت نہیں کرتی ہیں لیکن مجھے دادا جان سے جو سکون ملتا ہے وہ گھر کے کسی فرد سے نہیں۔

آجکل ہمارا گھر بھرا ہوا ہے۔ شازلی باجی اور عاصم بھائی جرمنی سے آئے ہوئے ہیں۔ نازلی باجی بھی کراچی سے آگئی ہیں۔ کلیم بھائی اور ان کی امریکن بیوی لاس اینجلس سے پہنچ گئے ہیں۔ گھر میں روزانہ کوئی نہ کوئی مہمان پرسے کے لئے آجاتا دوسری طرف ٹیلی فون کی گھنٹیوں کا سلسلہ نہیں ختم ہوتا۔ اتنا سب کچھ ہونے کے باوجود گھر میں اداسی ہے۔ میں بھی دادا جان سے چھپ چھپ کر کسی کونے میں بیٹھ کر رو لیتی ہوں۔ ابھی دس روز پہلے میری امی یعنی دادی جان فوت ہو گئی تھیں۔ طبعیت تو ان کی اتنی خراب نہیں تھی البتہ بلڈ پریشر کی مریضہ تھیں بڑھاپے کی وجہ سے کمزوری بڑھتی گئی اور ایک روز شام کو ان کو اختلاجی دورہ پڑا ڈاکٹر بلایا گیا ایمبولنس آگئی وہ ہسپتال پہنچنے سے پیشتر ہی اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ یوں تو گھر میں

سب کو اداس کر گئیں لیکن ابو کو بالکل تنہا کر گئیں۔ ان دونوں بزرگوں میں آپس میں اتنی محبت تھی کہ میں ان کو مذاق میں کبھی کبھی سفید کبوتروں کا جوڑا کہا کرتی۔ رنگ میں دونوں براق جیسے سفید اور بزرگی کے تقدس نے ان کو اور بھی پاکیزہ ہستیاں بنا دیا تھا۔

میں تو ویسے ہی ابو سے بہت قریب تھی اب تو اور بھی ان کی ہر چیز کا خیال رکھتی۔ ان کے پاس بیٹھ کر علمی' سیاسی اور خاندانی باتیں پوچھا کرتی۔ سارا دن تو میرا اپنے کالج کی ملازمت میں گزرتا مگر جب واپس آتی تو سب سے پہلے ابو کو سلام کرتی ان کی خیریت پوچھتی اور اپنے سارے دن کی روئیداد ان کو سناتی۔ میرا کھانا بھی چھمن بوا سینی میں لگا کر اسی کمرے میں لے آتیں اور میں منہ ہاتھ دھو کر ان سے باتیں کرتی۔

ہوا یوں کہ میں جب تین سال کی تھی تو میری ممی نے خودکشی کر لی تھی۔ وہ موت میرے لئے ایک معمہ تھی اور اس پراسرار حادثہ کی تفصیل مجھے کبھی کسی نے نہیں بتائی۔ ایک بار دادی جان نے مجھے کہا تھا کہ تمہاری ماں نے اپنی جان دے دی تھی نہ ہم لوگوں کو آج تک وجہ معلوم ہوئی اور نہ ہی پولیس پتا لگا سکی مگر یہ چبھن میرے اندر کچوکے لگاتی تھی کہ میری سگی ماں نے ایسا کیوں کیا؟ اپنی معصوم بچی کا بھی خیال نہیں کیا حالانکہ دادا جان اور دادی جان نے میری پرورش پھولوں کے سیج پر کی اور مجھے ممی کی کمی محسوس نہیں ہونے دی اور نہ ہی کبھی مجھے خیال آیا کہ ماں کا پیار کیسا ہوتا ہے۔

یہ دونوں تو میری چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کا خیال رکھتے۔ مجھے پڑھایا لکھایا اور پاپا بھی مجھے مالی ضرورت کے لئے اکثر نقد یا چیک کی صورت میں کچھ نہ کچھ دیتے رہتے اور خیال رکھتے۔

البتہ اگر کبھی میں کسی کو کھٹکتی تو وہ تھیں دلہن بھابھی گو کہ گھر میں کسی کو ظاہر ہونے نہیں دیتی تھیں لیکن دادا جان اور دادی جان تاڑ جاتے بزرگوں کی نظر تو قیامت سے کم نہیں اور شاید اسی لئے وہ مجھے بے حد پیار و محبت سے رکھتے تھے گھر میں بچپن سے سب کی لاڈلی رہی بلکہ دادی اماں تو مجھے کبھی کبھی اپنے باغ کی نازک کلی کہا کرتی تھیں اور دادا جان فوراً" ان کو ٹوکتے کہ ایسے نہ کہو نظر لگ جاتی ہے اور خزاں کی زد میں ہمیشہ کلیاں ہی ہوتی ہیں۔ گھر میں ایک پھول پہلے ہی مرجھا چکا ہے ان کا اشارہ میری ممی کی طرف ہوتا۔ دلہن بھابھی کو میں خار کی طرح کھٹکتی کیونکہ ان کی اپنی کوئی اولاد نہ ہو سکی۔

قصہ مختصر یہ کہ میں ناز و نعم میں پل کر جوان ہو گئی۔ پڑھ لکھ گئی اور دادا جان کی آنکھوں کا تارا تھی جسے دیکھ کر ان کی آنکھوں میں چمک آجاتی لیکن میری آنکھیں جو اپنی ممی کی طرح بتائی گئی تھیں ان میں ہنسی کے بدلے ایک اداسی بسیرا کئے رہتی۔ چونکہ عزیز رشتے دار جب مجھے دیکھتے تو اکثر یہ فقرہ دہراتے کہ یہ بالکل بنی بنائی زرینہ ہے۔ ویسی ہی کالی کالی خوبصورت آنکھیں لیکن زرینہ کی آنکھوں میں تبسم رقص کرتا تھا مگر اس کی آنکھیں-----اور یہ کہہ کر چپ ہو جاتے میں ان کو کیا بتاتی کہ یہ ایک کسک ہے جو میرے دل میں ہر وقت چبھتی رہتی ہے اور میری آنکھوں کی اداسی اسی کا پر تو ہے۔ میں اندر سے ہمیشہ اپنے کو نا مکمل محسوس کرتی کہ وہ کون سی ایسی بات تھی جس نے میری ماں کو یہ قدم اٹھانے پر مجبور کردیا اور اس دائمی خلش نے میری آنکھوں میں خیمہ ڈال لیا ہے۔

میری اپنی سہیلیاں بھی کہتیں کہ تمہاری آنکھوں میں جھیل کی گہرائی ہے لیکن اس میں اداس کشتی ڈولتی نظر آتی ہے اور اس بات کو خود جب میں آئینہ میں تلاش کرتی تو مجھے ان کی لاش ہچکولے لیتی نظر آتی۔ میرے بستر کے پاس ممی کی ایک تصویر رکھی رہتی تھی اور جب میں اپنی تصویر برابر میں رکھتی تو میری آنکھوں سے اداسی اور ان کی آنکھوں میں معصوم شرارت

ایک روز میں نے دادا جان سے پوچھا کہ آپ دادی جان سے بہت محبت کرتے رہے یا آپ نے کسی اور سے بھی محبت کی؟ اس سے پہلے دادا جان کی آنکھوں میں ایک نمی سی آگئی۔ جیب سے رومال نکال کر پوچھا اور مسکرائے کہ یہ سوال تمہارے ذہن میں کیوں آیا۔ بس ایسے ہی۔ وہ مجھ سے ایسا سوال پوچھنے کے متوقع نہیں تھے۔ چلو آج تم کو اپنی کہانی سناتے ہیں۔

ہم دو بھائی تھے۔ میرا چھوٹا بھائی بہت خوبصورت تھا اور تمام خاندان والے میرا اور اس کا مقابلہ کیا کرتے تھے اور سب کی توجہ کا وہ مرکز تھا۔ محلے کی لڑکیاں بھی چھپ چھپ کر اس کو تاکا کرتی تھیں۔ اندر باہر سب ہی جگہ وہ اپنی خوبصورت شخصیت کی وجہ سے مقبول تھا۔ رنگ تو ہم سب ہی کا صاف تھا لیکن میں اتنا خوبصورت اور پر کشش نہ تھا اور ہمیشہ نظر انداز ہی کردیا جاتا تھا۔ میں اپنا وقت پڑھنے لکھنے اور کھیل کود میں صرف کرنے لگا۔ میں نے اپنے کمرے میں رسالے کتابیں جمع کرنا شروع کردیں۔ وہی میرا بستر بچھونا بن گئیں۔ میری خالہ زاد بہن صفیہ

جو خود بھی کافی خوبصورت تھی لیکن اس کے مزاج میں سنجیدگی کا عنصر تھا۔ اس میں اور مجھ میں کئی چیزیں مشترک تھیں یعنی تعلیم کا شوق، کھیلنے کودنے کا شغل اور وہ انہی تمام چیزوں میں مصروف رہتی وہ کسی لڑکے کو لفٹ ہی نہ دیتی اس نے ہمیں بھی کبھی لفٹ نہیں دی۔ مگر مجھے وہ پسند تھی اور میری امی کی بھی خواہش تھی کہ میرا اس سے رشتہ ہو جائے لیکن وہ تو میرے چھوٹے بھائی وسیم میاں کے خواب دیکھ رہی تھی۔ اور اندر ہی اندر ان کے غم میں سلگتی رہی جس کا اندازہ یہ صاحبزادے نہ لگا سکے۔ اپنی جوانی اور شباب کے دور میں بھلے برے کی تمیز کہاں تھی۔ اس ڈال سے پھول توڑا کبھی اس ڈال سے۔ صفیہ کی تعلیم ختم ہوئی تو اس کی شادی کسی اور سے ہو گئی اور وہ سعودی عرب چلی گئی۔ رہ گئے ہم تو ہماری سنو گھر میں وسیم میاں کی شادی محلے کی ایک نوعمر لڑکی سے طے پائی۔ امی جان تو ان کی حرکتوں سے واقف تھیں۔ انہوں نے فوراً ان کے عقد کی تاریخ طے کر دی۔ اس تقریب میں خاندان کی لڑکیاں بالیاں بھی تھیں۔ وہاں پر ایک لڑکی فوزیہ نام کی بڑی اسمارٹ سی ہم کو چپکے چپکے دیکھ رہی تھی۔ ہم تو ٹھہرے اس میدان میں اجنبی وہ اچانک میرے پاس آئی اور کہنے لگی چلئے لان میں بیٹھیں کچھ گپیں ہوں گی۔ ہماری بھی اندر اندر خواہش ہوئی اس نے ہم کو خود اعتمادی کی ٹوکریاں بھر بھر کر پیش کرنا شروع کر دیں اور بقول کسے پھر ملاقاتیں بڑھیں اور پیار نے انگڑائی لی۔ بہت جذباتی لڑکی تھی۔ میری پڑھائی کا آخری سال تھا اور مجھے پھر ٹریننگ کے لئے باہر جانا تھا۔ اگر میرے نمبر اچھے آئے تو میرا سلیکشن ہو جائے گا یہ کڑی شرط تھی۔ ادھر ان صاحبہ نے محبت کی پینگیں بڑھانا شروع کیں اور ایک دن ایک انگوٹھی جو ناگن کی شکل کی تھی میری انگلی میں پہنا دی۔ میں نے بھی تحفے دینا شروع کئے کبھی کسی ندی کے کنارے ملنا ہو رہا ہے تو کبھی کشتی رانی وہ ایک طوفان کی طرح میری زندگی میں داخل ہو گئی اور ہم آہیں بھرنے اور تھوڑی بہت شاعری بھی کرنے لگے۔ زندگی میں ایک موڑ آنے ہی والا تھا کہ اچانک ایک روز اس نے ہم کو خبر سنائی کہ اس کی شادی کسی ڈاکٹر سے طے ہو گئی جو امریکہ جا رہا ہے لہٰذا فوراً ہی یہ سب کچھ طے پایا ہے۔ وہ مجبور ہے لیکن اسے کوئی اعتراض نہیں ہے اس رشتے پر۔ میرے اوپر ایک بجلی گری۔ ان دنوں صفیہ بھی سعودی عرب سے آئی ہوئی تھی وہ یہ سب دیکھ رہی تھی ایک وہی اپنی رازدار نظر آئی۔ ہم نے جاکر سارا قصہ اسے سنایا وہ بہت غضب ناک ہوئی۔

اس کو میرے اوپر رحم آیا گو کہ وہ مجھ سے محبت تو نہ کر سکی تھی۔ ایک روز صفیہ مجھے اپنے ایک دوست کے گھر لے گئی وہاں ایک لڑکی مجھے دکھائی اور کہا یہ بیچاری بہت دکھی ہے اپنی بہن کے ساتھ رہتی ہے زیادہ پڑھی لکھی تو نہیں ہے مگر وہ معصوم خوبصورت تمیزدار لڑکی تھی۔ کبھی کبھی میں صفیہ کی سہیلی نجمہ سراج کے گھر چلا جاتا تھا۔ مجھے ہمیشہ وہ لڑکی باورچی خانے میں کام کرتی نظر آتی۔ میں نے اس سے دو چار باتیں کیں وہ بھی کسی غلط فہمی کا شکار نہیں تھی۔ میں نے اس کی رائے پہلے معلوم کی اور پھر اس سے شادی کر لی۔ وہ لڑکی میری زندگی میں تمام خوشیاں لے آئی جو ایک مشرقی بیوی اپنے شوہر کو دے سکتی ہے۔ یہ تھیں تمہاری دادی جان جو مجھے اور تمہیں تنہا چھوڑ کر اب جا چکی ہیں۔ میری وہ چنگاری جس کو وہ لڑکی اپنی بے وفائی سے راکھ میں دبا گئی تھی تمہاری دادی جان نے بالکل بجھا دیا اپنی محبت اور خلوص کی ٹھنڈک سے۔

ہمارے یہ بچے طارق، عارف، شازلی اور نازلی پیدا ہوئے۔ ہماری زندگی غم دوراں اور غم جاناں کا شکار نہ ہونے پائی بلکہ مزے سے گزرتی رہی۔ میں نے بیچ میں دادا جان کو ٹوکا کہ یہ بتائے نہ کہ میری ممی نے اپنی جان خدا کے حوالے کیوں کی۔ ہاں بیٹی اب میں اسی موڑ کی طرف تو آ رہا ہوں۔

طارق میاں نے ایک دن خبر دی کہ وہ ایک لڑکی کی محبت کا شکار ہو گئے ہیں اور نگار اس بے وفا کی بیٹی ہے جس نے مجھ سے فلرٹ کیا تھا۔ میں نے بہت کوشش کی کہ یہ اس شادی سے باز آجائیں لیکن عشق کا بھوت نہ اتر سکا طارق کی ضد تھی اور ایک روز انہوں نے ہم لوگوں کو بتائے بغیر اس سے سول میرج کر لی۔ جب وہ اپنی دلہن کو لے کر گھر آئے تو وہ سراپا اپنی ماں کی تصویر تھی۔ میں دیکھ کر لرز گیا کہ کہیں طارق بھی میری طرح بے وفائی کا شکار نہ ہو جائے لیکن اس کی آنکھ میں وفا کے ستارے ناچ رہے تھے میں نے اسے گلے لگا لیا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو لیلیٰ مجنوں کی طرح چاہتے رہے مگر تھوڑے عرصہ کے بعد میاں طارق بھی اپنے چچا میاں وسیم کے قدم بہ قدم چلنے لگے راتوں کو دیر سے آنا تمہاری ماں کو نظر انداز کرنا۔ وہ اندر ہی اندر کڑھتی چلی گئی۔ زندگی کے ابتدائی سال تو رنگینی میں گزرے پھر دھیرے دھیرے نوک جھونک شروع ہو گئی۔ ہم لوگ سمجھاتے لیکن فائدہ نہ ہوتا اسی دوران

تمہاری بھی پیدائش ہو گئی۔ تمہاری ماں نگار طارق کو بے تحاشا چاہتی تھی لیکن طارق میاں اپنی رنگ رلیوں میں ان کی وفا نہ پہچان سکے۔ ایک روز دفتر میں فون کی گھنٹی بجی عارف نے خبر سنائی کہ بھابھی نے خودکشی کر لی ہے۔ پولیس آئی چھان بین ہوئی پوسٹ مارٹم ہوا کچھ نہ پتہ چلا۔ تمہارے پاپا کو بھی نہیں معلوم کہ اس بے وفا کی بیٹی کتنی وفادار نکلی۔ ایک روز تمہاری نانی جان نے مجھ سے کہا کہ تمہارے بیٹے نے بدلہ لے لیا۔ میں نے کہا نہیں تمہاری بیٹی نے مجھ پر ایک طمانچہ مارا ہے کہ یہ وفا ہے۔ تمہارے پاپا کو نہیں معلوم کہ ان کی ساس میری محبوبہ تھیں جن کے حوالے میں نے اپنا بیٹا کر دیا مگر وہ بچی اتنی عظیم نکلی جو تمہاری ماں تھی۔ یہ کہہ کر دادا جان نے مجھے گلے سے لگا لیا۔ میں نے کہا دادا جان آپ کتنے عظیم انسان ہیں اپنے دل کا درد دور کرنے کے لئے ہمارے زخم پر مرہم رکھتے ہیں۔

میرا قلم اور میرا چشمہ

این فرینک نو کی ڈائری نہ جانے کتنی بار وہ پڑھ چکی تھی مگر اسے وہ لڑکی اپنی کتاب سے نکل کر کچھ اتنا متاثر کر گئی تھی کہ وہ اس کو اکثر تنہائی میں نکال کر پڑھا کرتی۔ این فرینک کی ڈائری میں یہ بات ہے کہ اس کا کوئی بھی صفحہ کھول لو تو بھی اتنا ہی لطف آئے گا۔ تحریر کی سب سے بڑی خوبی یہی ہوتی ہے کہ آپ کہیں سے بھی اس کو پڑھ ڈالیں۔ اس کو این فرینک کا یہ جملہ بہت پسند آیا تھا کہ کاغذ میں کتنا صبر ہوتا ہے کہ آپ اس پر کچھ بھی لکھ ڈالیں وہ اس کو جذب کر لے گا۔ کچھ اسی طرح **نینا** کو اپنے قلم سے محبت تھی۔ جب وہ بہت پژمردہ اور غمگین ہوتی تو اپنا قلم لے کر بیٹھ جاتی اور لکھتی چلی جاتی۔ اس کا قلم اس کا کتنا فرمانبردار تھا۔ وہ اس کے کہنے پر کاغذ پر قلمی گھوڑا دوڑا دیتا۔ قلم اس کی زندگی کا بڑا مضبوط سہارا تھا جو اس کے دل کے رستے ہوئے زخموں کو اپنے اندر جذب کرلیتا اور موتی بنا کر کاغذ پر بکھرا دیتا۔ اگر اس کا رونے کو جی چاہتا تو وہ آنسو قلم اپنے اندر جذب کرلیتا اور جب وہ اپنی ڈائری ختم کرلیتی تو قلم اس سے کہتا بہت تھک گئی ہو سو جاؤ۔

وہ اکثر سوچتی کہ جو لوگ صحیح معنوں میں ادیب ہوتے ہیں' وہ ذاتی شہرت سے بہت بے نیاز ہوتے ہیں۔ وہ تو صرف اس لئے لکھتے ہیں کہ اظہار کریں۔ اسے یاد آیا ابھی پچھلے ہفتہ ہی تو بات ہو رہی تھی اس کی اپنی ایک سہیلی سے جو اپنی کتھا اس کو سنا رہی تھی اور یہ بیچ میں بس اتنا کہتی کہ ہاں سن رہی ہوں یا کوئی سوال کر ڈالتی۔ وہ کہتی تم سے بات کر کے مجھے بڑی تسلی ہوتی ہے گو کہ بولنے والی خود ایک نفسیاتی ڈاکٹر تھی جو کبھی کبھی وہ **نینا** سے کہتی کہ تم اپنے مافی الضمیر کا اظہار نہیں کرتی ہو۔ تم کس قدر خوش رہتی ہو مجھے بھی سلیقہ سکھا دو **نینا** مسکرا کر خموش ہو جاتی۔ کبھی کبھی **نینا** کہتی۔ نیلم تم ڈائری لکھا کرو۔ وہ کہتی ارے میں تو اتنی تناؤ کا شکار ہو جاتی ہوں کہ بس جی چاہتا ہے روؤں' اکیلی رہوں' ارے نیلم قلم اٹھاؤ اور ساری اپنی بھڑاس کاغذ پر لکھ دو دیکھو کتنا سکون ملے گا۔

کتابیں اور قلم۔ یہ سب تو بہت پیارے دوست ہیں اور اس کو فرینک یاد آتی کہ اس چھوٹی سی لڑکی نے کیسے ڈائری سے دوستی کی تھی اور مطمئن تھی۔ اسے اپنا بچپن یاد آگیا کہ وہ اپنی ڈائری میں خدا سے باتیں کرتی اور کہتی کہ اللہ میاں آپ بھی اس کاغذ کی طرح کتنے اچھے ہیں۔ میری سب باتیں سن لیتے ہیں۔ میری نظمیں میری غزلیں میری الٹی سیدھی باتیں نہ تو یہ کاغذ کچھ کہتا ہے اور میرا دوست قلم ہی تو جو میری زبان ہے' میرا قاصد ہے میں چھوٹی تھی تب بھی اور اب بڑھاپے نے زندگی کے دروازے پر دستک دے دی ہے پھر بھی میرا قلم میرے ساتھ ساتھ چل رہا ہے۔ اس کو یاد آیا کہ اس نے سنا کہ فنا کانپوری نے مرنے سے پہلے کہا تھا اپنا دیوان چھپنے سے پہلے میرے سینے میں جو آگ شعلہ فشاں ہے اس کو بجھانے کے لئے مجھے اپنے آنسوؤں کی ضرورت نہیں بلکہ یہ انگارے الفاظ کا لبادہ اوڑھ کر میرے قلم کے ذریعے صفحہ ء قرطاس پر آبدار موتی بن کر چمکتے رہتے ہیں اور نہ جانے کتنے قاری اس میں اپنا عکس دیکھ کر ایک تسکین محسوس کرتے ہیں اور مجھے لگتا ہے کہ جس نے بھی سنا کہنے لگا میری کہانی ہے۔ اگر میرے الفاظ لوگوں کے لئے آئینہ بن جائیں تو میرے قلم کی سب سے بڑی کامیابی ہوگی۔

دلدل

مجھے آج اس کے مرنے کی خبر ملی، پتہ چلا کہ وہ ایک عرصہ سے کینسر کا شکار تھا۔ اس کی تو مجھے خبر نہ ملتی وہ تو فراز جو ہمارے پڑوس میں رہا کرتا تھا اس کی آصف سے کافی دوستی تھی۔ اس کی بیوی مجھے نیو جرسی کے ایک اسٹور میں جوتوں کے سیکشن میں نظر آئی۔ وہ دوڑتی ہوئی میرے پاس آئی۔ "ارے باجی آپ کیسی ہیں دیکھئے ہم لوگ بھی یہاں آگئے۔" "ارے تم یہاں کہاں میں نے حیرت سے اسے دیکھا جو گلشن اقبال والے گھر میں سامنے رہا کرتی تھی۔ اس نے جواب دیا بس رضی بھیا نے ہمارا بھی گرین کارڈ بنوادیا مگر ہم لوگ کراچی بھی جاتے ہیں۔ آپ کے گھر بھی آصف کی وجہ سے چلے جاتے ہیں۔ آپ کو تو پتہ ہی ہو گا کہ آصف بھائی کا تو انتقال ہو گیا۔ میں پاکستان سے ابھی دو چار روز گزرے واپس آئی ہوں۔ وہاں سب لوگ یہ باتیں بھی کر رہے تھے کہ آصف بھائی نے مرنے سے پہلے وصیت کی تھی کہ ان کے مرنے کے بعد دو دو لاکھ روپیہ ان کے بچوں کو ضرور دے دیا جائے یعنی فی بچہ اور مکان میں سے بھی حصہ دیا جائے جو بھی ان کا حق بنے۔

باجی ایک بات کہوں اگر آپ برا نہ مانیں تو وہ آپ کو بہت یاد کرتے تھے۔ آپ ان کو چھوڑ کر آگئیں۔ انہوں نے آپ کا کئی سال انتظار کیا اور بہت عرصہ تک دوسری شادی بھی نہیں کی۔ خیر یہ آپ کا ذاتی معاملہ ہے آپ خود بہتر جانتی ہیں۔ مرنے سے پہلے تو وہ بہت اداس رہنے لگے تھے۔ اچھا باجی میں چلوں گی مجھے شازیہ کے لئے جوتا خریدنا ہے یہ کہہ کر وہ مڑگئی اور مجھے لگا وہ مجھے منوں مٹی کے نیچے دبا کر چل دی۔ time square کی بلند عمارت مجھے اپنے سر پر بوجھ لگنے لگی۔ میں نے راستے سے ایک کارڈ خریدا اور آصف کی امی کو لکھ کر ڈال دیا اس میں میں نے صرف دو سطریں لکھیں کہ میں سمجھ سکتی ہوں کہ ایک جوان لڑکے کی موت کا ماں پر کتنا اثر ہوتا ہے۔

صفیہ تو خبر سنا کر دکان سے یہ جا اور وہ جا مگر کتاب ماضی کے اوراق میرے ذہن پر الٹنا

شروع ہو گئے کہ میں نے اپنا بسا بسایا گھر چھوڑ دیا اور ایک روز اپنے تینوں بچوں کو لے کر کراچی چلی گئی اور آصف سے کہا کہ میں کمزور ہو گئی ہوں چند ماہ میں اماں کے پاس آرام کرنا چاہتی ہوں۔ اماں بچوں کی نگرانی کرلیں گی۔ اماں نے بھی یہ سچ ہی سمجھا۔ دراصل میں چپکے فریدہ سے جو امریکہ میں تھی خط و کتابت کرنا چاہتی تھی۔ فریدہ نے کالج میں میرے ساتھ چار سال پڑھا تھا اس کی شادی امریکہ سے آئے ہوئے ایک لڑکے سے ہو گئی تھی۔ اس کے خط آیا کرتے جب وہ وہاں کے حالات لکھتی تو مجھے لگتا کہ کسی پرستان کی باتیں لکھتی ہے۔ میرا جی چاہتا کہ میں بھی وہاں کی سیر کروں اگر کبھی میں آصف سے امریکہ کا ذکر لے بیٹھتی تو وہ مجھے بری طرح ڈانٹ دیتا کہ دور کے ڈھول سہانے ہوتے ہیں۔ گو کہ وہ میرا خیال بھی بہت رکھتا اور کہا کرتا یہاں ہم کو کس چیز کی کمی ہے۔ میں بچپن سے ہی امریکہ کے خواب دیکھا کرتی تھی۔

دراصل ہوا یوں کہ فریدہ ایم ایس سی کرکے امریکہ سدھاری اور میں نے بھی فرسٹ کلاس ایم ایس سی کیا مجھے ایک کالج میں نوکری ملی وہ بھی بہاولپور میں یہ ملازمت گورنمنٹ کی تھی اور ہم کو ایک کرایہ کا گھر لینا پڑا۔ اماں اور بھیا کا خرچ بھی میرے ہی ذمہ تھا کیونکہ دو سال پہلے ابا کا ہارٹ فیل ہو گیا اور ہم لوگ مالی پریشانیوں کا شکار ہو گئے۔ اماں کے پاس جو زیور تھا وہ انہوں نے بیچ کر میری یونیورسٹی کی فیس ادا کردی تھی۔ میری اس چھوٹی سی چادر میں ہمارا پورا خاندان پاؤں پھیلاتا اور جیسے تیسے گزر ہوتا کبھی اخراجات آمدنی سے زیادہ ہو جاتے اور گھر کا کرایہ وقت پر ادا نہ ہو پاتا۔ مالک مکان بھی زیادہ پریشان نہ کرتے اور ہم لوگوں پر قرض بڑھتا گیا۔ میرا ذہن اس پریشانی سے بوجھل رہتا۔ ادھر اماں بھی اندر ہی اندر دکھ سہہ رہی تھیں جوان لڑکی گھر میں بیٹھی بیٹا ابھی اس لائق نہیں ایک دن آخر کار مالک مکان نے آکر تقاضا کیا کہ اب کب تک میں آپ کا انتظار کروں یا تو میرا مکان خالی کردیں یا کرایہ دیں میں اور اماں ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہے تھے۔ ہم لوگوں کا منہ اترا دیکھ کر اس نے کہا البتہ اس کا ایک حل ہے کہ آپ اپنی بیٹی نگار کی شادی مجھ سے کردیں صورت شکل کا وہ اچھا نہیں تھا لیکن بظاہر بے حد شریف زادہ لگتا تھا۔ اماں نے کہا کہ ہم کو سوچنے کا موقع دیں۔ تمہارا اس کا جوڑ تو نہیں ہے بالکل۔ وہ خاموش کمرے سے نکل گیا۔ یہ بات اس کو یقیناً "بہت بری لگی ہو گی۔ چند روز بعد اس نے اپنی ماں کو بھیجا کچھ سوچ ساچ کر اماں نے ہاں کردی اور میری اس سے شادی کردی گئی۔ لاہور سے اماں نے ماموں جان کو بلا کر مشورہ کیا انہوں نے بھی کہا کہ باجی

آپ کے حالات ایسے ہیں اور لڑکا بھی برا نہیں لڑکے کی صورت شکل تھوڑی دیکھی جاتی ہے۔

ہمارے گھر کے مالی حالات بھی بدل گئے۔ اس نے اماں اور بھیا کی بھی ذمہ داری سنبھال لی۔ اماں کھانا پکاتیں ایک ملازم بھی اس نے رکھ دیا۔ بھیا پڑھنے چلا جاتا اس کی فیس بھی وہی بھرتا۔ میں نے اپنی سرکاری نوکری نہیں چھوڑی۔ وہ میرا بہت خیال رکھتا تھا۔ میرے دو تین بچے بھی پیدا ہوگئے جس میں اماں نے پرورش کرنے میں بھی میری بہت مدد کی۔ مگر میں نہ جانے کیوں اس زندگی سے مطمئن نہ تھی۔ فریدہ جب بھی امریکہ سے آتی تو ایسا لگتا کہ جیسے کوہ قاف سے پری آئی ہے اور وہاں کے قصے سنا رہی ہے مجھے اس پر بے حد رشک آتا۔ میں بچپن سے ہی مادہ پرست تھی۔ اس سے کہتی فریدہ کیا یہ ممکن ہے کہ میں بھی امریکہ آجاؤں کوئی ترکیب نکال۔ بھیا بڑا ہو چکا وہ بھی اب اماں کو لے کر الگ کراچی میں رہنے لگا تھا۔ میں ان کے پاس اکثر چلی جایا کرتی اور چپکے چپکے وہاں سے فریدہ کو خط لکھا کرتی۔ آخر فریدہ نے میرے بلانے کا حل نکال ہی لیا اس نے مجھے اپنی ماں کا attendant بنا کر بلا لیا۔ اور جیسے تیسے ترکیبیں نکال کر میں تینوں بچوں کو لے کر آصف کو بتائے بغیر امریکہ روانہ ہوگئی۔ بعد میں آصف نے مجھے بہت تلاش کیا۔ اماں نے بھی کہا کہ ان کو کچھ نہیں معلوم۔ امریکہ میں مجھے ایک پرائیویٹ نرسری میں نوکری مل گئی وہ بھی کسی ایشین کی تھی پھر میں نے اپنا ایک appartment کرایہ پر لے لیا۔ اس نرسری کے مالک کبھی کبھی مجھ سے پوچھا کرتے کہ ان بچوں کے باپ کہاں ہیں۔ میں نے جھوٹی سچی کہانیاں بنانا شروع کردیں کہ میرا شوہر بہت ظالم تھا۔ وہ باہر جانے کے خلاف تھا اور وہ کسی قیمت پر اپنا ملک چھوڑنا نہیں چاہتا ہے۔ اور ہمارا وہاں اس قلیل آمدنی میں پورا نہیں ہوتا تھا۔ اپنے بچوں کے مستقبل کی خاطر اور وہاں کے بگڑے حالات دیکھ کر مجھے نکلنا پڑا لیکن وہ ابھی تک اپنی ضد پر قائم ہے۔ اسی طرح کی باتیں بنا کر میں اس کو ٹال دیا کرتی۔ چونکہ میں صورت شکل کی اچھی خاصی تھی نرسری کا مالک بھی جواں تھا وہ پہلے تو مجھ سے ہمدردی کرتا اس کے بعد پھر وہ بھی میری طرف راغب ہوگیا۔ اس طرح رہتے رہتے ہم کو سات سال ہوگئے۔ آخر اس کے اصرار پر میں نے اس سے شادی کرلی اور اخبار کے ذریعہ اعلان کردیا یعنی کاغذی طلاق حاصل کی۔ پہلے چند ماہ تو ہمارے بہت اچھے گزرے یہ صاحب میرا خیال بھی کرتے۔ بچوں سے بھی دلچسپی لیتے لیکن رفتہ رفتہ مجھے حاصل کرنے کے بعد ان کے رویے میں تبدیلی آنا شروع ہوگئی۔ مجھ سے ملازمت بھی چھڑا دی۔ یہ

امریکہ جو میرا خواب تھا اب میرے لئے ایک جہنم بننا شروع ہو گیا تھا۔ بچے اکثر اپنے باپ کے بارے میں پوچھتے میں کہہ دیتی وہ بہت ہی ظالم آدمی تھا جب تم لوگ اسکول چلے جاتے تھے تو میرے ساتھ برا سلوک کرتا تھا میں تم لوگوں کو بتاتی نہیں تھی۔ اگر وہ کبھی پاکستان جانے کا ذکر کرتے یا ملنے کی خواہش کا اظہار تو ہمیشہ ان سے کہتی کہ وہ تم کو مجھ سے چھین لے گا ملنے نہیں دے گا۔ اس قسم کی باتیں ان کے ذہن نشین کردیں۔ ادھر فرید میرا دوسرا شوہر گھر اکثر دیر سے آتا۔ کئی کئی دن غائب رہتا۔ اس لئے میں نے اماں کو اور بھیا کو بھی گرین کارڈ دلوا دیا اور اپنے پاس بلا لیا۔ میں نے نماز پڑھنا شروع کردی اپنے گناہوں کی معافی مانگتی۔ فرید نے ضد کی کہ چلو حج کرلیں اماں کو اور بچوں کو لے کر حج کرنے گئی۔ اماں بے چاری تو ویسے ہی کمزور تھیں۔ مکہ میں حج کے دوران دھکم پیل میں گر پڑیں اور اٹھانے کے باوجود وہ جانبر نہ ہو سکیں ضعیفی نے ویسے ان کو کمزور کردیا تھا وہ بھی مجھے چھوڑ کر چلی گئیں۔ فرید کو بھی محسوس ہوتا تھا کہ میں ان کے ساتھ بھی خوش نہیں ہوں مجھے محسوس ہوتا تھا کہ میں کسی دلدل میں پھنس گئی ہوں اور اس روشنی کے ملک نے جسے کولمبس نے دریافت کیا اور میں اس کی چکا چوند کے جال میں پھنس گئی۔ بچے اپنی اپنی زندگیاں تعمیر کر رہے تھے۔ اور میں اکیلی پڑی رہتی ایک روز فرید اور میں کسی کام سے باہر نکلے نیو جرسی سے نیویارک جا رہے تھے بس میں ایک شخص داخل ہوا۔ وہ مجھے بہت غور سے دیر تک دیکھتا رہا فرید نے کہا یہ کون تھا جس کو تم دیکھ رہی تھی مگر وہ حیران پریشان تھا کیا جانتی ہو اس کو۔ وہ پچھلی سیٹوں کی طرف چلا گیا۔ میں نے کہا کوئی پاگل تھا شاید ذہنی مریض ہو گا۔ اگلے اسٹاپ پر اتر گیا۔ میں نے دھیرے سے کہا بھگوڑی میں اندر ہی اندر تڑپ کر رہ گئی جس کو میں پاگل کہہ رہی تھی وہ تو وہ ہی شخص تھا جس نے مجھے' میری ماں کو اور میرے ننھے سے بھائی کو پریشانی میں سہارا دیا تھا اور میں اس کو چھوڑ کر چلی آئی۔

یہ سب کچھ میرا اپنا کیا دھرا تھا۔ بچے بھی دھیرے دھیرے مجھے چھوڑ کر چلے گئے' پڑھ لکھ گئے۔ فرید اپنے کاموں میں مصروف رہتے۔ یہ زندگی تھی نہ اس میں کوئی مزہ تھا آج اس محلے کی لڑکی نے مجھے ایک یاد ماضی سے ملا دیا۔ میں نے گھر آکر پاکستان جانے کا پروگرام بنایا۔ میں ماموں کے گھر میں بیٹھی تھی کہ اچانک کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ سعید ماموں کے چھوٹے بیٹے نے دروازہ کھولا یہ آصف کا چھوٹا بھائی فواد کھڑا تھا کہنے لگا سنا ہے کہ بھابھی آئی ہوئی ہیں ان سے کہئے کہ بھیا کا انتقال ہو چکا ہے مگر ان کے وصیت نامے میں دو دو لاکھ تینوں بچوں کے دینے

کا ذکر ہے جو میں لایا ہوں اور مکان کے بھی بکنے کے بعد حصے ہوں گے جس میں سلیم، علیم اور سعدیہ کے اپنے حصے ہوں گے اگر بچے اور بھابھی آکر یہ معاملات طے کرلیں البتہ بھابھی کا کچھ ذکر نہیں لکھا ہے کہ شاید انہوں نے دوسری شادی کرلی ہے۔

یہ سب باتیں سن کر میرا جی چاہا کہ میں وہیں اپنی جان دے دوں۔ امریکہ کے چکر میں کس دلدل میں پھنس گئی۔ وہ لڑکا یہ کہہ کر چلا گیا میں چند روز پاکستان رہ کر جب واپس آئی تو اس وصیت نامے کی ایک کاپی مجھے ملی اس کو کھولا تو فرید نے کہا تم تو کہتی تھی کہ وہ آدمی بہت برا تھا۔ میں نے کہا نہیں میں خود شیطان تھی جو پیسہ کی لالچ میں اس جیسے نیک شوہر کو چھوڑ کر بھاگ آئی۔ شاید پہلی مرتبہ میرا ضمیر جاگ اٹھا تھا۔ پھر میں نے اس کی خوبیاں گنوانا شروع کیں۔ بچے بھی میرے اردگرد کھڑے تھے میں یہ کہہ کر فرید کے قدموں میں گر گئیں۔ فرید نے بڑی زور سے ایک ٹھوکر ماری اور کہا تم نے ایک فرشتہ صفت شوہر کی قدر نہ کی تو میری.....

ننھی پری

ہیڈ ٹیچر کے کہنے پر ثروت نے اسکول کے تمام مسلمان بچوں کے لئے نماز پڑھنے کی جگہ کی ذمہ داری قبول کرلی تھی۔ ویسے اس کے اسکول میں مسلم بچے آٹے میں نمک کے برابر تھے۔ مگر ثروت کو اپنی اسلامی تہذیب' زبان اور اقدار کی پاسبانی کا بہت احساس تھا۔ گو وہ خود اتنی زیادہ حد تک ان پابندیوں کو پورا نہ کرپاتی مگر ایک بار جب سے وہ اپنے ملک سے باہر آئی تھی ایک بات کا بہت خیال رکھتی کہ وہ یہاں اپنے ملک کی نمائندہ ہے اور انگریزی معاشرہ ہر صورت میں اس کو ایک اسلامی اور پاکستانی باشندہ مانتا ہے اور اس کے ہر ہر قدم پر اس کو اسی نظر سے دیکھے گا جیسے چاول دم ہونے پر ایک دانہ دیکھ کر رائے قائم کی جاتی ہے کہ چاول گل گئے اس بات کی پاسداری کا اس کو بے حد خیال تھا اور اسی لئے اسکول میں اپنے لباس' اپنے وقار کی وجہ سے بہت احترام سے دیکھی جاتی۔ کھانے کے وقفہ کے دوران اس اسکول کے چند طلباء جو باقاعدہ نماز کے پابند تھے' وہ اس کے پاس بھیج دیئے جاتے' جہاں وہ ان کو اس کمرے میں بھیج دیا کرتی جو اس نے اسکول میں بہت جدوجہد کے بعد ان شاگردوں کے لئے حاصل کیا تھا۔ کبھی کبھی ثروت بھی بلکہ رمضان کے زمانے میں جاکر ان بچوں کے ساتھ فرض نماز ادا کرلیتی' وہیں پر ایک سانولی سی لڑکی بہت پابندی سے نماز کے لئے آیا کرتی۔ ثروت کو یہ لڑکی بہت ہی متاثر کرتی' اس کے نقوش بھی کوئی خاص تیکھے نہ تھے۔ نمکین چہرہ لیکن مونا لیزا سا چہرہ تقدس سے بھرپور اور نیم کھلے ہونٹوں پر تبسم بکھرا رہتا۔ اس خاموش پسند لڑکی پر ثروت کی نظر اکثر پڑا کرتی چونکہ ثروت اسے پڑھاتی نہیں تھی تو ثروت اس کو زیادہ جانتی بھی نہ تھی۔ مگر اس کا چنبیلی سا بدن ضرور ثروت پر ایک تاثر نقش کرگیا تھا۔

ثروت چونکہ اسکول میں کافی مقبول تھی جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ باہر سے آئے ہوئے بچوں کے مسائل حل کرنے میں بھی اسکول میں بہت دلچسپی لیا کرتی۔ ایک طرح سے وہ کونسلنگ بھی کرتی۔ دو تین زبانیں جاننے کی وجہ سے اس کی اہمیت اسکول کے طلباء میں کم

نہ تھی۔

ایک دن اس لڑکی یعنی جس کو ثروت مونالیزا کے نام سے پکارتی یعنی اسٹاف روم میں اپنے مزاج کی وجہ سے وہ نام رکھ لیا کرتی تھی۔ دراصل اس لڑکی کا نام تانیہ تھا۔ تانیہ کی کلاس ٹیچر نے کہا کہ ثروت میری کلاس میں تانیہ جو ہے بلکہ جس کو تم مونالیزا کہتی ہو' اس کے سلسلے میں کافی پریشان ہوں کیا تم اس سے بات کر سکتی ہو۔ کبھی کبھی وہ بہت زیادہ ہی اداس ہوتی ہے۔ اس کے برابر میں وہ جو پونم بیٹھتی ہے نا' وہ اس کی گہری دوست ہے۔ آج اس نے بتایا کہ وہ تو بہت ہی سخت مظالم کا شکار ہے۔ ثروت نے کہا کہ میں اپنی پہلی فرصت میں معلوم کروں گی کہ کیا معاملہ ہے۔ دوسرے روز ثروت نے جاکر اس لڑکی کو کلاس سے بلا کر بات کی اور کہا کہ شاید تم اپنی پڑھائی پر پوری توجہ نہیں دے پا رہی ہو اور ہوم ورک بھی پورا نہیں کرتی ہو۔ میں تمہاری مدد اسکول کے بعد کردیا کروں گی۔ خاص طور پر انگریزی میں اور سائنس میں' کیا خیال ہے۔ اس کی مونالیزا والی اداس مسکراہٹ لوٹ آئی' آنکھوں میں چمک آگئی۔ ارے ہاں مس میں تو خود آپ سے پوچھنے والی تھی۔ اب تانیہ سے ثروت دھیرے دھیرے بے تکلف ہونے لگی۔ ایک دن ثروت اسکول کے بعد اس کو اپنے کمرے میں لے گئی' وہاں میز پر ثروت کے بچوں کی تصویریں میز پر ایک فریم میں لگی رکھی تھیں۔ تانیہ نے کہا کہ "مس یہ کون ہیں؟" ___ "یہ میرے بچے ہیں" یہ لڑکی اس نے میری بیٹی کے چہرہ پر ہاتھ رکھ کر پوچھا "یہ کون ہے؟" ___ "یہ میری بیٹی ہے' بس ایک ہی بیٹی ہے اور دو بیٹے ہیں۔" "یہ تو بالکل آپ کی شکل ہے۔ آپ ایسی ہی ہوں گی جب اس کے برابر ہوں گی۔" "ہاں تانیہ عام طور پر لڑکیاں اپنی ماں کی شکل ہوتی ہیں۔ بڑے ہو کر وہ بہت ملنے لگتی ہیں چونکہ وہ ماں کے جسم کا حصہ ہوتی ہیں نا۔

"واقعی" اس نے حیرانگی سے پوچھا۔

"ارے تم سائنس تو پڑھتی ہو نا۔ بچے' ماں باپ کی شکل کے ہوتے ہیں۔" ثروت نے بے نیازی سے جواب دیا۔

"اور' آواز.....؟" اس نے بے چین ہو کر پوچھا۔

"آواز' آواز تو بہت ملتی ہے۔ خاص طور پر ٹیلی فون پر بالکل ہی دھوکہ ہو جاتا ہے سب کو۔ جو بھی مجھے فون کرتا ہے "ہائے اللہ" اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ "میری ہی کیا' میری تمام سہیلیوں کی لڑکیوں کی آواز اسی طرح دھوکہ دیتی ہے۔" ثروت نے جواب دیا۔

''مس ایک بات اور بتایئے کیا میں بھی اپنی امی جیسی نکلوں گی۔ میری آواز اور صورت بھی ویسی ہی ہوگی''اس نے گہرے جذبات کے لہجے میں ڈوب کر پوچھا۔

''ہاں بھئی ہونا تو چاہئے لیکن ضروری نہیں'' ثروت نے کہا۔

''میں اپنے پاپا کی شکل بالکل نہیں ہوں''اس نے کہا۔

''تم کو کیسے معلوم؟'' ثروت نے کہا۔

''اس لئے کہ آئینہ جو روز دیکھتی ہوں'' وہ مسکرائی تمہاری امی جیسی شکل ہوگی پھر۔

وہ بولی ''مجھے کیا معلوم جب ہی تو آپ سے پوچھ رہی ہوں۔''

''تو تمہاری امی کہاں ہیں؟'' ثروت کے تجسّس نے انگڑائی لی۔

وہ......تو......چلئے چھوڑیئے۔

''نہیں بتاؤ''

''وہ تو بلجیم میں ہیں''

''تم کس کے ساتھ رہتی ہو؟''

''میں اپنے پاپا کے ساتھ''

''اور......؟''

''پاپا کی بیوی بچوں کے ساتھ رہتی ہوں۔''

''تمہاری سوتیلی ماں؟''

''جی''

''وہ کیسی ہیں تمہارے ساتھ؟''

''آپ یہ بات کسی کو بتایئے گا نہیں''

''نہیں میں کسی کو نہیں بتاؤں گی تمہاری ذاتی بات ہے''

''آپ بہت اچھی ہیں اپنے بچوں کے ساتھ رہتی ہیں''اس نے ثروت کی دکھتی رگ پر انگلی رکھ دی۔

''میں تمہاری بات کر رہی ہوں''

''آپ کو ایک بات بتاؤں؟ یہ سب لوگ بہت خراب ہیں''اس نے نظریں جھکا کر بہت دھیمے لہجے میں کہا۔ ''کیوں'' ثروت کو تانیہ کے مسائل کا سرا ملنا شروع ہوا۔

''وہ لوگ مجھے پسند نہیں کرتے۔''اس نے دکھ بھرے انداز میں جواب دیا۔

”آپ کو دیکھ کر جی چاہتا ہے کہ کاش! آپ میرے پاپا سے شادی کر لیتیں“ اس کی پلکوں پر آنسو چمک رہے تھے۔

”ارے کیسی باتیں کرتی ہو“ ثروت ہکا بکا رہ گئی اس کے اس معصوم جملے پر۔

”اچھا میں چلتی ہوں“ ثروت نے کھسیا کر کہا۔

”میری بھی کلاس ہے آپ خفا تو نہیں ہو گئیں۔“ وہ بولی نہیں چلو تمہاری بھی کلاس ہے میری بھی۔ ثروت نے کمرے کی چابی اٹھاتے ہوئے کہا۔

پھر تانیہ کبھی کبھی ثروت سے مدد لینے آجایا کرتی۔ ایک دن تانیہ اور پونم، ثروت کے کمرے میں آئیں۔ پونم نے ثروت کو ایک نوٹ دیا جو اس کی ٹیچر نے بھیجا تھا، اس میں لکھا تھا، اس کے جسم پر نیل کے نشان ہیں۔ ویسے بھی اس روز کے بعد سے ثروت محتاط بھی ہو گئی تھی لیکن مسلسل اس سلسلے میں سوچ رہی تھی۔

”ہاں تانیہ آؤ“ ثروت نے کہا۔

”پونم تم اپنی کلاس میں جاؤ۔“

”آج پاپا نے مجھے پائپ سے مارا ہے بہت۔ مجھ سے چائے کی پیالی ٹوٹ گئی“

”اتنی سی بات پر“

”رات کو میں ہوم ورک کر رہی تھی تو چولہے پر ہنڈیا رکھی تھی۔ وہ جل گئی اور گھر میں دھواں بھر گیا۔ امی نے رات کو ان سے شکایت کر دی تو صبح کو مجھے ڈر لگ رہا تھا۔ پاپا نے آواز دی، میں چائے پی رہی تھی، میرے ہاتھ سے پیالی گری، ہمارے باورچی خانے کے فرش پر ٹائلز لگے ہیں جو بھی چیز گرتی ہے، ٹوٹ جاتی ہے۔ بس میری شامت آجاتی ہے۔ امی رات کو پاپا سے شکایت کر دیتی ہیں۔“

”پھر اکثر تم کو مار پڑتی ہے“

”کبھی بھیا شکایت کر دیتا ہے، کبھی رفیعہ“

”تم کو معلوم ہے اس ملک میں مارنا پیٹنا جرم ہے؟“

”خدارا مس کسی کو نہ بتایئے گا۔ اگر اسکول میں رفیعہ کو معلوم ہو گیا تو وہ گھر میں بتائے گی اور مجھے اس سے بھی زیادہ مار پڑے گی۔“

”کیا تمہاری بہن رفیعہ اسی اسکول میں پڑھتی ہے؟“

”جی ہاں!“

"ارے وہ رفیعہ جو بہت بدتمیز لڑکی ہے؟"

"جی جی" اس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

"نہیں یہ راز کی بات ہے لیکن اسکول کے ان تمام لوگوں کو بتانا ہے جن کا اس بات کو جاننا ضروری ہے۔"

"کیوں"

"اس لئے کہ یہاں کا قانون ہے کہ جسمانی سزا بچوں کو ماں' باپ یا استاد نہیں دے سکتے سخت قانون ہے"

پھر کیا ہوگا اب

"آؤ تم کو تمہاری ٹیچر کے پاس لے چلوں"

سوشل ورکر۔ ہیڈ ٹیچر ہیڈ آف ڈپارٹمنٹ اسکول کی مشینری حرکت میں آ گئی۔ تانیہ کے ماں باپ کو وارننگ دے دی گئی۔

اب اس کو جسمانی ضرب تو نہیں لگائی جاتی مگر طعن و تشنیع کے انبار لگتے چلے گئے۔ وہ کبھی کبھی آکر ثروت کو بتا دیا کرتی۔

دراصل اس کا چہرہ جب بھی اداس ہوتا' ثروت سمجھ جاتی کہ یقیناً" گھر میں کوئی کاروائی اس کے خلاف ہوئی ہے اور وہ اس کو بلا کر کونسلنگ کرتی۔ ایک دن ثروت کے دروازے پر دستک ہوئی۔

"اندر آجاؤ"

دروازہ کھلا۔ اندر آنے والی تانیہ تھی اس کے چہرے پر اعتماد بکھرا ہوا تھا جو بہت غضب کا تھا بلکہ حیرانی کی حد تک "گڈ مارننگ مس"۔ آپ سے ایک بات کرنا ہے وقت ہے؟"

"ہاں ہاں آؤ کاپیاں دیکھ رہی تھی۔" اس نے کاپیاں سمیٹتے ہوئے کہا۔

آپ ایک دن قانون کی بات کر رہی تھیں۔ میں اس گھر سے جانا چاہتی ہوں۔ کیا آپ مجھے adopt کرلیں گی؟"

"ہیں" یہ کیا کہہ رہی ہو!"

"جی مس میں آپ کے گھر کا سارا کام کردیا کروں گی جسے لوگ اسپئیر رکھ لیتے ہیں نا ویسے ہی رکھ لیجئے" تانیہ نے اصرار کیا۔

"یہ ممکن نہیں بھئی"

میں تو کھانا بھی کم کھاتی ہوں۔ آپ کا فون بھی استعمال نہیں کروں گی۔ ۔ ، شاور لیتی ہوں روز صبح صبح ناشتہ میں صرف چائے کی ایک پیالی۔

ارے یہ نہیں ہو سکتا۔

میں پھر سیٹرڈے جاب بھی کرلوں گی تو بلوں میں اپنا حصہ دے دوں گی۔

''میرے پاس جگہ نہیں ہے'' میں نے جواب دیا۔

جی میں اب وہاں رہ ہی نہیں سکتی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔

''کیوں؟''

''میری سوتیلی ماں اپنے بھائی سے میری شادی کرانا چاہتی ہے۔ وہ اس ملک سے باہر پاکستان میں ہے، بس اس کو بلانا چاہتی ہے۔''

''تم گھر سے بھاگنا نہیں'' ثروت نے پیار سے ہاتھ رکھا۔

''میں اور ایک بات بتاؤں اگر آپ کسی سے نہ کہیں'' اس نے رازدارانہ انداز میں کہا۔

''نہیں کہوں گی بتاؤ کیا بات ہے؟''

رات کو بھیا نے دراز کھولی، اس میں اس کو valentine card مل گیا۔ اس نے فوراً پاپا کو دیا تو پھر بس پاپا نے کہا اب تم اس کے بعد نہیں پڑھو گی کیونکہ تم اب سولہ سال کی ہو، پڑھائی ختم اور چپکے سے وہ لوگ مجھے جہلم لے جا رہے ہیں یعنی تیاری کر رہے ہیں کیونکہ میں برٹش نیشنل ہوں نا۔

''اف خدایا'' ثروت کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ ''میں گھر سے بھاگنا نہیں چاہتی کیونکہ یہاں پر ہمارے معاشرہ کی بہت بدنامی ہوتی ہے کہ پاکستانی لڑکیاں گھر سے بھاگ جاتی ہیں۔''

''اب کیا کرو گی میں تم کو مشورہ نہیں دے سکتی'' ثروت نے جان چھڑانا چاہی۔

''پھر''

بس اب تم بڑی ہو گئی ہو، خود اپنا اچھا برا سوچ سکتی ہو۔

میرے پاس تو امی کا پتہ بھی نہیں ہے، وہ کبھی تحفہ بھیجتی ہیں لیکن پاپا مجھے ان کا پتہ نہیں دیتے۔ ایک دن انہوں نے صرف خط دکھایا تھا، جس میں لکھا تھا کہ شکریہ آپ اس کا خیال رکھتے ہیں......بس۔

''اچھا سنو پڑھائی پر دھیان دو ایسا نہیں ہوگا کہ وہ تم کو زبردستی لے جائیں تم خود بہت عقلمند ہو۔''

وہ منہ لٹکا کر چلی گئی۔ ثروت نے ساری رپورٹ لکھ کراس کے فائل میں نتھی کردی۔

ثروت رجسٹر لے کر دفتر میں داخل ہو رہی تھی تو کلرک نے اس کو ایک لفافہ دیا کہ یہ ہیڈ ٹیچر نے آپ کو آپ کے Comment کے لئے بھیجا ہے۔ اسے کھولا تو وہ کسی لڑکے کی طرف سے تانیہ کے نام تھا۔ اس پر لکھا تھا۔

''تانیہ فکر نہ کرو' اب تم سولہ سال کی ہو چکی ہو۔ ہم کو اب کوئی جدا نہیں کر سکتا ہے۔ ہم سول میرج کرلیں گے اور یہ معصوم روح ہماری محبت کی گواہی دے گی۔''

تمہارا اپنا

جاوید

اس پر دو دل بنے تھے اور کیوپڈ کا تیر جو ایک ننھے بچے کی شکل میں اس پر معصومیت سے تھامے ہوئے تھا۔ ثروت کے ہاتھ میں کارڈ تھا اور اس کے چہرے پر ''نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن'' کے تاثرات سوالیہ نشان بن کر بکھر گئے۔ ننھی پری کے چہرے پر مونالیزا کی مسکراہٹ چکنا چور ہو کر رہ گئی۔

تم ہی مری آنکھیں ہو

اس کو وطن کی یاد جب بھی آتی کلیجہ چیر کے رکھ دیتی لیکن بیوی ' بچوں کی ذمے داری اس خیال کو ذہن سے نوچ کر پھینکنے پر مجبور کرتی۔ کتنا عرصہ ہوگیا ہے اس ملک میں آئے ہوئے۔ اس ملک میں آنے کے لئے ہمارے دیس کے لوگ تڑپتے ہیں۔ ہر جائز اور ناجائز کام کرنے کے لئے تیار ہوجاتے ہیں۔ کسی کو کیا معلوم کہ ہمارے دل پر کیا گزرتی ہے۔ شکیل اکثر یہ سوچ کر اداس ہوجاتا اور پائپ کو سلگا کر اپنے لان میں پڑی سفید کرسی پر براجمان ہوتا۔ گھر کے پچھلے باغ میں رئیسہ نے بڑی خوبصورتی سے چیری اور پھول دار پودے لگائے ہوئے تھے۔ ایک طرف سیب اور ناشپاتی سے لدے ہوئے درخت جن سے کچھ ٹوٹ ٹوٹ کر زمین پر پڑے رہتے۔ وہاں دو چار کرسیاں اور ایک سفید میز پر ایک چھاتا بھی لگا ہوا تھا۔ گھاس پر ایک طرف فٹ بال جو شاید پڑوس کے بچوں کا تھا اسے منہ چڑاتا۔ کس قدر خاموش تھا یہ ملک۔ اتنا سناٹا جہاں لذت فریاد بھی حاصل نہ ہوسکے۔ دونوں بچے دن میں اسکول چلے جاتے۔ رئیسہ اپنے گھر کے کاموں میں اس کلاک کی طرح ٹک ٹک کرتی پھرتی جو نہر کی پن چکی بن چکی تھی۔ شکیل رات کی ڈیوٹی کرتے کرتے عاجز آچکا ہوتا لیکن کرے بھی کیا۔ فیکٹری میں رات کے پیسے زیادہ ملتے تھے۔ بسکٹ فیکٹری کی بیکری کی تمازت نے شکیل کے جذبات کو بھون کر رکھ دیا تھا۔ آج جب وہ اپنے لان میں آکر بیٹھا اور رئیسہ ایک مشین کی طرح اس کے لئے کافی کا مگ میز پر رکھ کر یہ کہہ کر چل دی۔ میں بچوں کو اسکول سے لینے جارہی ہوں۔ دس منٹ کے بعد گیس کا چولھا بند کردیجئے گا۔ اچھا' خیالوں میں گم شکیل نے جواب دیا اور پھر پائپ کا ایک کش لیا۔ اس کو پھر گھر یاد آنا شروع ہوگیا۔ اس نے ایم اے کیا اور رزلٹ ملتے ہی ملک سے باہر نکلنے کے خواب دیکھنا شروع کردیئے۔ جیسے لندن ایئرپورٹ پر جنت کی حوریں اس کے لئے منتظر بیٹھی ہیں اور وہاں دودھ کی نہریں بہہ رہی ہیں اور یہ پریاں اس کو شہد سے شیریں جام پلانے کی ساقی ہوں۔ جوانی بھی دیوانی ہوتی ہے' جانے کس کس خوش فہمی میں مبتلا کردیتی ہے۔ بس

یہ ہی سب سوچ کر شکیل بھی ماں باپ کو روتا چھوڑ شیخ چلی کی طرح اپنا ملک چھوڑ کر چل دیا۔ ماں نے سینے پر پتھر رکھ کر اجازت دے دی۔ باپ نے سوچا مستقبل بن جائے گا۔ بھائی جان نے شفقت سے سر پر ہاتھ پھیر کر دعا دی۔ جاؤ میاں دیوار سے چھلانگ لگانے' زعفران کے کھیت پاؤ یا خوبصورت بہشت-----ہجرت تو مسلمان کی قسمت ہے۔ خدا تم کو اپنے ارادوں میں کامیاب کرے۔ نہ جانے کون سی گھڑی تھی چل پڑے۔ کیا کیا نہ مصائب سہے۔ شکوہ بھی کس سے کرتے' نہ کوئی اپنا نہ پرایا' ہاتھ میں ایم اے کی ڈگری' زبان سے بے بہرہ' تھوڑی بہت آنے سے کیا ہوتا ہے۔ یہاں تو گفتگو عوام سے ہے' لہجہ مختلف اپنے خیالات کو لباس پہنانے کے لئے الفاظ چاہئیں۔ زبان بولنے پر عبور نہیں۔ چند پاکستانی ادھر ادھر ٹرینوں میں نظر آجاتے تو دوڑ کران سے سلام' دعا' مزاج پرسی' کسی کے پاس وقت نہیں۔ ریلوں میں مسافر اخبار پڑھتے نظر آتے۔ بات بات میں شکریہ' مہربانی' معاف فرمایئے۔ غلطی ہوگئی کے تراجم کی ضرورت انگریزی میں دقت نہیں ہوئی لیکن ہر لمحے کے بعد اس کا استعمال حیران کرتا ورنہ بدتہذیبی سمجھی جاتی۔ چند اپنے کالے بھائیوں نے یہ بات ضرور ذہن نشین کرادی تھی یا پھر انگریزوں سے موسم پر ایک آدھ جملہ ضرور روزانہ سننے کو ملتا۔ اپنے اپنے کاموں میں مصروف دنیا تھی۔ دو چار سے سلام دعا کے بعد اتنا ضرور معلوم ہوگیا کہ کسی فیکٹری' دکان میں شاید یا پھر کسی ہوٹل میں مزدوری مل سکتی ہے۔ گاڑی بھی چلانا نہیں سیکھی تھی جو بس ڈرائیور بن جاتے۔ بس کنڈیکٹر بننے کے لئے بھی تھوڑی بہت انگریزی آنا ضروری تھا۔ ڈاک خانے میں بھی کچھ اپنے بھائی نظر آئے تو وہاں بھی مسئلہ زبان کا تھا۔ بڑی مشکل سے ایک جگہ ڈاکیہ بنادیئے گئے لیکن انگلستان کی سردی نے جب طبیعت صاف کی تو وہاں سے رسی تڑا کر بھاگے۔ ایک ایشیائی دکاندار نے مشورہ دیا کہ اسٹور میں کوشش کرو۔ شیلف پر کام یعنی سامان لگانے کی نوکری ملے گی۔ وہاں بھی تین چار ہفتے میں طبیعت صاف ہوگی۔ بھاری بھاری سامان اٹھانا رکھنا۔ البتہ اتنا ضرور ہوا کہ کچھ روزمرہ کام چلانے کی گٹ پٹ سیکھ گئے اور وہاں پر ایک لڑکی جو رہتی تھی اس کو بھی ہمدردی ہوئی۔ اس سے دوستی ہوگئی۔ حرام و حلال کے چکر سے بھی بچے۔ جہاں جاؤ وہاں ملاوٹ' ہمارے ملک میں جو ملاوٹ ہوتی ہے اس سے بالکل مختلف' یہاں تو ہر چیز میں شراب یا سور کی چربی۔ انگریزی پڑھنا تو آتی تھی۔ پھر یہ مسئلہ اتنا آسان نہ تھا۔ خیر رئیسہ بڑی مہذب لڑکی تھی اس نے حل کردیا۔ شریف طبع ہونے کے ناطے اس کو پیغام دے دیا اور اس کے ماں باپ بھی آسانی سے راضی ہوگئے۔ چٹ منگی پٹ بیاہ۔ بس اس سلسلے میں

بہت ہی خوش نصیب نکلے۔ اس کے بعد رئیسہ کے گھروالوں نے ایک کمرہ کرائے پر دلوادیا۔ دونوں کی ملی جلی نوکری سے کام چلنا شروع ہوگیا لیکن ان کو یہ پسند نہ آیا کہ وہ ملازمت کرے، اسے سمجھا بجھا کر گھر میں بٹھایا اور خود ایک دوست کے مشورے پر بسکٹ فیکٹری میں ملازمت کرلی اور دھیرے دھیرے کمرے سے مکان میں آگئے۔ بس یہ ہی زندگی تھی۔ گھر کو فرنیچر سے آراستہ کیا۔ بیوی سگھڑ تھی۔ اسی اثنا میں دو بچوں کا بھی گھر میں اضافہ ہوگیا لیکن اس طرح کبھی کبھی شکیل کا خاموش ہوجانا رئیسہ کو پریشان کردیتا۔ وہ سوچتی شاید شکیل اس شادی سے مطمئن نہیں، وہ ہمیشہ ہی خاموش ہوجاتا، آج بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ رئیسہ بچوں کو لے کر واپس آئی تو میاں شکیل اداس خلاؤں میں گم تھے۔ کیا بات ہے آپ اکثر ایسے ہی خاموش ہوجاتے ہیں میں بھی ملازمت کرلوں۔ یہ رات کی ڈیوٹی سے آپ کی جان چھوٹے۔ نہیں رئیسہ ایسی بات نہیں۔ یہ ضرور سوچتا ہوں کہ اس ہجرت نے ہمیں کیا دیا۔ ہمارے ملک کا تمام نوجوان طبقہ ملک سے بھاگا جارہا ہے۔ ملک پڑھاتا لکھاتا ہے، ٹریننگ دیتا ہے۔ انجینئر، ڈاکٹر بناتا ہے۔ ماں باپ اور ملک اپنے تمام ذرائع ہم پر خرچ کرتے ہیں اور ہم موقع نکال کر وہاں سے فرار حاصل کرلیتے ہیں، اپنی تن آسانی کے لئے اور وہاں یا تو نکھٹو لوگ یا پھر جن کے پاس باہر بھاگنے کا ذریعہ نہیں ہوتا یا پھر کھاتے پیتے گھرانوں کے نوجوان یعنی جاگیردار، وڈیروں کی اولاد رہ جاتی ہے۔ ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ ان ترقی یافتہ ممالک کی مدد کررہا ہے اور یہاں آکر بھی وہی غلامی، نسل پرستی کا شکار۔ لیکن ہمارے یہ بچے تو غلام نہیں ہوں گے اپنا حق چھین لیں گے۔ رئیسہ نے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ہاں ضرور لیکن اپنے کلچر کی قربانی دے کر۔ بی بی رئیسہ اور انہوں نے اپنی زبان تو سیکھی ہی نہیں۔ یہ بھی نقصان میں اور ہم بھی نقصان میں۔ چلئے چھوڑیئے کس کا نقصان، کس کا فائدہ۔ یہ تو نسل در نسل ہوتا ہی آرہا ہے شکیل میاں۔

رئیسہ میری بات سنو، وہ قومیں مرجاتی ہیں جن کی زبان مرجائے۔ زبان تو ماضی اور پورا عہد اپنے ساتھ لے کر سینہ بہ سینہ چلتی ہے بھئی میں تو شکر کرتی ہوں کہ سر پر چھت ہے کھانے کو روٹی ہے اور آمد و رفت کے لئے گاڑی ہے اور کیا چاہئے آپ کو؟

اور چائے کے لئے بسکٹ شکیل نے لقمہ دیا۔

جی نہیں وہ تو سارے جو آپ لاتے ہیں میں پڑوسیوں کو بانٹ دیتی ہوں اس میں تو سور کی چربی ہوتی ہے لیکن بسکٹ ہی نہیں، یہ تمہارے بچے بھی پڑوسیوں میں بٹ جائیں گے سب کچھ کھودو گی۔

نہیں ایسا نہیں ہوگا، ہم واپس چلیں گے بس بچے تعلیم حاصل کرلیں۔ جایئے، نہایئے کھانا کھایئے۔ ڈیوٹی پر جانے کا وقت ہورہا ہے۔ ارے یاد آیا کل ہفتہ ہے نا، برائٹن چلیں گے بچوں کو لے کر۔ میں پکنک کا سارا سامان لے آئی ہوں۔

زیادہ نہ سوچا کیجئے آپ گنجے ہوجائیں گے۔

شکیل اٹھ کر نہانے چلے گئے اور اپنی بسکٹ فیکٹری کی طرف گاڑی کا رخ کردیا۔

راستے میں انہیں اپنی گلیاں بہت یاد آئیں۔ آنے کے بعد ایک کے بعد ایک خاندان کا بزرگ رخصت ہورہا ہے۔ آنے کے دو سال کے بعد ہی ابا کا انتقال ہوگیا۔ اماں ایک ماہ کے بعد ہی رحلت کر گئیں۔ بس کراچی میں ایک مشفق شخصیت بھائی جان کی رہ گئی تھی اور بھابی جن کے اپنے کوئی اولاد ہی نہیں تھی مگر وہ شکیل سے اتنی محبت کرتی تھیں جیساکہ وہ ان کی ماں ہوں۔ شکیل اور رئیسہ اپنی ذمے داریوں کی وجہ سے کبھی پاکستان کا چکر بھی نہ لگا سکے۔ رئیسہ چونکہ کینیا سے آئی تھیں اور ان کے والدین بھی لندن میں مقیم تھے تو انہوں نے اس جذبے کو کبھی سمجھا بھی نہیں حالانکہ بہت ہی سلجھی ہوئی خاتون تھیں۔

شکیل بھائی جان کو کبھی کبھی چھوٹی موٹی رقم بھیج دیا کرتے۔ خط و کتابت کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ بھائی جان چونکہ عمر میں شکیل سے پندرہ بیس سال بڑے تھے۔ اب بوڑھے بھی ہوتے جارہے تھے۔ کبھی کبھی خط میاں شکیل کو دیکھنے کو آنکھیں ترستی ہیں۔ کبھی تو ملک کا چکر لگا جاؤ۔ اپنی ملازمت کی مصروفیات اور بچوں بیوی کو چھوڑ کر جانے کو اس کا جی بھی نہ کرتا لیکن جب خط آتا تو اکثر اداس ہوجاتا۔

کبھی کبھی خط کو آئے دو دو ماہ گزر جاتے۔ اب کی مرتبہ کچھ ایسا ہی ہوا۔

ہفتہ کا روز تھا۔ شکیل اخبار جنگ کے مطالعے میں مصروف تھا۔ وہ روزانہ روزنامہ جنگ ضرور لاتا کیونکہ اس کی خبریں، اداریہ، ادبی صفحات، اشتہارات ہر لفظ کو وہ دیمک کی طرح چاٹ لیتا جیسے وہ اس کی روح کی غذا ہو حالانکہ اس کے دوست کہا کرتے کہ تم فضول پیسہ ضائع کرتے ہو۔ اخبار میں تو بیچنے کی وجہ سے سنسنی خیز خبریں اور مبالغہ آرائی ہوتی ہے۔ وہ خاموشی سے ان کی بات سنتا کہ انہیں کیا معلوم کہ اخبار سے میں اپنے ملک کی سیر کر آتا ہوں۔ اس کے الفاظ تو میرے لئے پر بن جاتے ہیں اور میں وطن میں اڑتا پھرتا ہوں۔ رئیسہ بھی اکثر کہتی جس ملک میں رہتے ہیں وہاں کی زبان اور خبریں پڑھا کریں۔ ہاں بی بی رئیسہ یہ تو چوبیس گھنٹے میرے اردگرد ہوتی ہیں انگریزی سنتا ہوں، پڑھتا ہوں، بولتا ہوں، ٹی وی اور

ریڈیو، انگریزی اخبارات۔۔۔۔۔یہ تو اوڑھنا بچھونا ہیں ہی۔ اچھا چلو ایک اچھی سی چائے کی پیالی پلاؤ۔

شکیل کبھی کبھی رات کو جانے سے پہلے اپنے بچوں کو کوئی لطیفہ یا کہانی بھی ضرور سنادیا کرتا۔ آج بھی اخبار اٹھاکر سرخیاں دیکھ رہا تھا کہ چھوٹے بیٹے نے ایک رجسٹر لاکر دیا۔ شکیل نے بھائی جان کا خط کھول کر پڑھا تو آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ رئیسہ ہائے کرتی آ گئی ارے کیا بات ہے؟ ابھی تو آپ ٹونی، مونا کو لطیفے سنا رہے تھے یہ کیا؟

بھائی جان کا خط آیا ہے ان کی ایک آنکھ میں موتیا اتر آیا ہے اور دوسری بھی خراب ہوتی جارہی ہے۔ کہتے ہیں کہ اس سے پہلے کہ میں نابینا ہو جاؤں اپنی صورت دکھا جاؤ۔ آپریشن ممکن نہیں فیس بہت بھاری ہے۔ بس بیٹے ایک بار آخری مرتبہ تم کو دیکھ لوں یہ آرزو ہے۔

"آپ چلے کیوں نہیں جاتے دیکھ آئیے جاکر"

"کرایہ کہاں سے لاؤں"

میں نے چائلڈ بینفیٹ کے پیسے جمع کئے ہیں، کرائے بھر کے نکل آئیں گے۔

ارے یہ کیسے ممکن ہے؟

کیوں نہیں ممکن؟

کیوں نا وہی پیسہ ان کی آنکھ کے آپریشن کے لئے بھیج دیں۔

ہاں ہاں ضرور، چلئے اٹھئے بس پیر کو بنک سے ڈرافٹ بنواکر بھیج دیجئے اور ان کو فون کر دیجئے ابھی ابھی۔

رئیسہ تم مجھے کہاں سے مل گئیں۔ میں نے تو سنا تھا ماں کے قدموں کے نیچے جنت ہے۔ تم ایسی بیوی کے بازوؤں میں بھی جنت ہے یہ کہہ کر شکیل نے رئیسہ کو گلے سے لگالیا۔

بھائی جان کے کامیابی سے آپریشن کی اطلاع مل گئی لیکن پھر وہی آرزو کہ کسی طرح مجھے اپنی صورت دکھادو۔

شکیل نے سوچا کہ ان کو کیا معلوم کہ کس طرح یہ رقم ان کو بھیجی گئی ہے۔

دن گزرتے رہے۔ ایک روز رئیسہ نے شکیل سے کہا "کیا آپ کی بکنگ ہو گئی ہے بس آپ دس دن کی چھٹی لے کر پاکستان جائیے۔"

ارے بھئی ٹکٹ کی رقم؟

فکر نہ کریں میں نے بچت کرلی ہے۔

رئیسہ بیگم نے شوہر کو بتائے بغیر اپنے جہیز کے تمام زیورات جاکر بیچے اور اپنی بچت کی رقم ملا کر ٹکٹ خریدا۔

شکیل کو چھٹی مل گئی کیونکہ کبھی چھٹی مانگی نہ تھی۔ مالک نے بھی بونس دے دیا۔

شکیل نے وہ پیسہ رئیسہ کو دینے کی خواہش کی تو اس نے کہا بھائی جان کے لئے ایک فریم چشمے اور بھابھی کے لئے ایک اچھا سا پرفیوم ڈیوٹی فری شاپ سے لے لیجئے گا۔

شکیل اللہ اللہ کر کے پاکستان چلا گیا لیکن اس نے کہا کہ میں اچانک پہنچوں گا تو ان کو خوشی ہوگی۔ شکیل کو ایئرپورٹ چھوڑ کر آنے کے بعد رئیسہ نے آتے ہی فون کردیا تاکہ شکیل کو کراچی ایئرپورٹ پر تکلیف نہ ہو اور بڑی بھابھی کو وقت اور فلائٹ نمبر بھی بتادیا۔

شکیل کراچی ایئرپورٹ سے نکلے ٹیکسی پکڑی گھر پہنچے۔ گھر میں گلشن بوا چوکی پر جانماز پر دعا مانگ رہی تھیں۔ ان کے بیٹے منو نے دروازہ کھولا جو اب چودہ سال کا ہو چکا تھا۔ گھر میں کوئی نہ تھا گلشن بوا نے لپک کر ان کو گلے سے لگایا سر پر ہاتھ پھیرا اور باقی سب لوگ کہاں ہیں شکیل نے پوچھا۔

وہ تو آپ کو لینے بی بی کے بھائی کی گاڑی میں ایئرپورٹ گئی ہیں۔

انہیں کیسے معلوم؟

رات کو رئیسہ بھابھی کا فون آیا تھا کہ وہ آپ کو ایئرپورٹ چھوڑ کر آئی ہیں۔

ارے رئیسہ نے تو سارا مزہ ہی خراب کردیا شکیل نے کہا۔

چلئے آیئے آتے ہی ہوں گے سب لوگ۔ آپ کا رنگ صاف ہوگیا ہے شکیل مسکرا کر جھینپ گیا۔

ارے یہ گلاب کے گملے تو منڈیر پر ویسے ہی رکھے ہیں جیسے امی رکھتی تھیں اور ابا پانی دیتے تھے۔ دوسری طرف موگرا کھلا ہوا تھا اور یہ چنبیلی کی بیل دروازے پر چڑھی ہے۔ ارے یہ صحن میں انار کا درخت بھی کتنا بڑا ہوگیا ہے۔ گلشن بوا کیا یہ رات کی رانی جو غسل خانے کے پاس ہے ابھی بھی کھلتی ہے۔ ہاں بھیا شکیل سب ویسا ہی بس۔ بیگم صاحبہ اور صاحب نہیں رہے۔ آپ کو بہت یاد کرتے تھے وہ دیکھئے سامنے آپ کی بڑی سی تصویر لگی ہے۔ بیگم اس کو روزانہ دیکھ کر دعا دیتی تھی میرا بچہ سلامت رہے اور یہ ٹرانسسٹر ابھی تک چلتا ہے شکیل نے اس کو کھول کر دیکھا، جی ہاں بھابھی کو دے کر گیا تھا میں۔

ارے یہ صراحیاں، مٹکیاں ململ سے ڈھکی ہوئی اور چاندی کٹورے اور گلاس ان پر

آپ نے پیسے بھیجے تھے فرج خرید لیا------ خرید لیا مگر بڑے بھیا کو صراحی اور مٹکی کا پانی پسند ہے کبھی کبھی بجلی چلی جاتی ہے نا۔

اچھا' شکیل نے چاروں طرف نظر دوڑاتے ہوئے کہا۔

بڑے بھیا کہتے فرج کے پانی سے نزلہ ہو جاتا ہے اس میں ان کو سوندھی خوشبو آتی ہے شاید۔

"اپنی مٹی کی خوشبو" شکیل نے جواب دیا۔

ایک کٹورے میں ہم کو بھی پانی دیجئے۔

وہ سامنے کمرے میں وہی ڈریسنگ ٹیبل ہے نا۔

جی ہاں۔

اور لکڑی کا چولہا بھی ابھی تک استعمال کرتے ہو سب.....؟

بھیا کو روٹی اسی پر ڈال کر دیتی ہوں۔ ان کو الٹے توے پر تپلی تپلی چپاتیاں اچھی لگتی ہیں نا۔

گیس کا چولہا بھی ہے گلشن بوا بولے جارہی تھیں.....

ارے یہ سرمہ دانی------اور وہ جھاڑ کھجور والی اور تنکوں والی

سب کچھ ویسا ہی ہے اس کو اپنا شور کرنے والا ویکیوم کلینز یاد آگیا۔

یہ چائے تیار ہے مسالے والی۔ الائچی بھی ڈال دی ہے میں نے

مگر یہ سب کہاں ہیں 'ابھی تک آئے نہیں۔ ارے بھئی یہاں تو حقہ بھی رکھا ہے۔

"بس آتے ہی ہوں گے۔ ایئرپورٹ دور ہے۔ آپ کو تلاش کررہے ہوں گے۔" منو نے بیچ میں لقمہ دیا۔

ایک دم فون کی گھنٹی بجی منو نے اٹھایا ایک منٹ ایک منٹ۔ شکیل بھائی سے بات کیجئے

کیا بات ہے شکیل دوڑا۔ فون پر ہسپتال سے نرس بول رہی تھی۔

ایئرپورٹ جاتے ہوئے دو کاروں کا بہت سخت ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے۔

منو اور شکیل ٹیکسی لے کر ہسپتال پہنچے۔ بھابھی کے پاؤں میں چوٹ آئی تھی لیکن بھائی جان آگے بیٹھے تھے تو آنکھوں میں شیشے چلے گئے وہ سخت حفاظتی روم میں ہیں۔ بس انہیں پریشانیوں میں شکیل کا وقت گزرا اور جب چند روز کے بعد آنکھوں سے پٹی ہٹی تو ڈاکٹر نے اطلاع دی کہ یہ ہمیشہ کے لئے بینائی کھو چکے ہیں۔

اب شکیل کراچی میں زیادہ ٹھہر ہی نہیں سکتے تھے۔ چلتے وقت شکیل نے بھابھی کو پرفیوم دیا اور بھابھی سے کہا کہ سنہری فریم بھائی جان کے لئے لیا تھا کہ اس میں لینس لگا کر بھائی جان

پہن لیں گے اب آپ اس میں سیاہ شیشے لگوا دیجئے گا۔

بھائی جان نے فوراً شکیل کا ہاتھ پکڑا میرے بیٹے میں نے تم کو دیکھ لیا چھو کر ہی تم کو محسوس کرنے کے لئے اس حادثے میں بچ گیا۔ تم بھابھی کے لئے خوشبو لائے ہو لیکن میرے لئے تو تم خود ایک خوشبو ہو۔ خوشبو دیکھی نہیں جاتی۔ وہ تو میرے دل و دماغ میں بسی ہوئی ہے۔ میری آنکھیں تو تم ہو۔

تاثرات

بانو کے افسانے

محترمہ بانو ارشد کا پہلا افسانوی مجموعہ ''بانو کے افسانے'' کو زبردست پذیرائی ملی اور پاکستان و ہندوستان سمیت امریکہ، یورپ اور دیگر ممالک میں ان پر مضامین، آرا اور تبصروں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ یہ تحریریں مختلف اخبارات اور ادبی جرائد کی زینت بنیں ان میں سے چند تحریریں آپ کے مطالعے کے لئے پیش کی جارہی ہیں۔ یاد رہے کہ محترمہ بانو ارشد کے افسانوی مجموعے ''بانو کے افسانے'' میں 21 افسانے شامل کئے گئے تھے جو یہ ہیں:

''ڈارلنگ، کٹی پتنگ، مغرب کی آزادیاں، طاقتور کون، معصوم گناہ، ننھی مفکر، ایک مسافر ایک فنکار، شادی جھوٹا بندھن، گلاب کا پھول، وقت گزاری، مہندی، شاعر کی بیوی بے چاری، کانچ کی چوڑیاں، انارکلی، اے لڑکی، بے بس، آخری باب، چنبیلی کے پھول، پانوں کی ڈبیہ، سلمیٰ خالہ، خوف۔''

(ادارہ دنیائے ادب)

راغب مراد آبادی

بانو کے افسانے

توجہ سے پڑھیں اہل نظر "بانو کے افسانے"
کریں گے ذہن پر ثبت اثر "بانو کے افسانے"

دسمبر کی ہے چھ اور رونمائی ان کی لندن میں
یہ امریکہ بھی لائے ہیں خبر "بانو کے افسانے"

حقائق اور مسائل زندگی کے' جان ہیں ان کی
ہیں افسانوں کی دنیا میں امر "بانو کے افسانے"

تھا ارشد تھانوی سے مجھ کو بھی ربط دلی راغب
انہیں کے فیض سے ہیں معتبر "بانو کے افسانے"

اسی سے پوچھئے' ہو جوہری جو شخص اس فن کا
کہ ہیں صد رشک لعل و گہر "بانو کے افسانے"

مبارکباد دو' عمران الارشد اور بانو کو
ہیں روشن مثل خورشید و قمر "بانو کے افسانے"

حمایت' شاعر و ناقد ہیں' افسانوں کے پارکھ بھی
کہیں گے وہ ہیں معراج ہنر "بانو کے افسانے"

کہے یہ شعر میں نے صبح دم نیویارک میں راغب
کہ ہیں مانند انوار سحر "بانو کے افسانے"

پروفیسر ریاض صدیقی

بانو کے افسانے

کسی بھی تخلیقی صنف کا تخلیق کار اچھا نقاد ہو سکتا ہے کیونکہ تخلیق کے تانے بانے میں لکھنے والے کی تنقیدی نظر کو تلاش کیا جا سکتا ہے۔ اینگلو امریکی ادب کی تاریخ میں تخلیق کار کے نقاد ہونے کی مثالیں ملتی ہیں، اردو میں بھی مگر بہت کم۔ سلطان جمیل نسیم اور امراؤ طارق طبعاً" افسانہ نگار ہیں اور اسی حوالے سے پہچانے جاتے ہیں مگر بانو ارشد کے تازہ افسانوی مجموعے "بانو کے افسانے" پر ان کی آراء حقیقت پسندانہ تنقید کی نشاندہی کرتی ہیں۔ اول الذکر نے اختصار اور احتیاط کے دائرے میں رہتے ہوئے لکھا ہے کہ "سب سے بڑی خوبی ان افسانوں کا قابل مطالعہ ہونا ہے۔ تقریباً" تمام افسانوں کے موضوعات وہی ہیں جو وطن اور سماج سے بچھڑی ہوئی خواتین کے ہوتے ہیں یعنی ایک اجنبی ماحول اور تہذیب سے الجھنا اور پھر سمجھوتہ کرلینا۔" آخرالذکر نے یہ لکھ کر کہ "کہانی صرف کہانی ہوتی ہے اور مصنفہ کے یہ افسانے کہانیاں ہیں۔" بات مکمل کردی ہے اس طرح افسانوں کی معنویت حقیقت اور سطح کا تعین ہوگیا ہے۔ کہانی بنانے اور لکھنے کا فن بانو ارشد کو آتا ہے۔ اب سوال ہے ہیئت اور تکنیک کا جن کے تنوع ترتیب اور زاویوں کی کوئی سرحد نہیں ہے اگر ان کے افسانوں پر ان اسالیب، فن، لہجہ، انداز بیان، حقیقت کی ماورائیت یا ان کے کہیں اوٹ میں ہونے کی چھاپ نہیں ہے جو جدیدیت اور اب بعد جدید سے منسوب ہیں تو اس سے ان کی کہانی نویسی پر کوئی حرف نہیں آتا ہے۔ اس کے باوجود جدید حسیت اور انگریزی کے اثر کی وجہ سے اور فقروں میں انگریزی پیوند کاری مواد اور بیان میں نیا پن ضرور پیدا کردیتا ہے۔ انگریزی اردو محاورہ سازی کا یہ سنگم اعلیٰ اور حکمران طبقے سے باہر نکلا تو پڑھے لکھے متوسط طبقے کے ہاتھ میں آگیا۔ یہ وبا صرف مغربی ملکوں میں رہنے والے مشرقیوں ہی میں عام نہیں ہے۔ ہمارے یہاں زیادہ

عام ہو گئی ہے۔ ان افسانوں کے کردار خاندانی تانے بانے میں ہوتے ہوئے بھی متوسط طبقے کے پڑھے لکھے الجھاؤں (complexes) میں مبتلا و بے سمت اور کیریئر ساز کردار ہیں مگر وہ مکالمات میں گفتگو نہیں کرتے ہیں بلکہ خود کو بیان کرتے ہیں۔ ان کا بیان سیدھا سادا اور سپاٹ ہے۔ یہ بھی کوئی خاص نہیں ہے جس کو جواز بنا کر ان کی کہانیوں کو غیر فکشن کہا جائے۔ مغربی ملکوں سے پچھلے دو تین سالوں کے دوران جتنی بھی بہترین اور ہٹ تخلیقات شائع ہوئی ہیں اور جن کا رسالوں اور اخباروں میں چرچا ہوا ہے' اسی بیانیہ اسلوب کی مظہر ہیں۔

چترا بنرجی دیو کارانی کے تازہ افسانے بھی اس کی مثال ہیں (مطبوعہ بلیک سوان 1997ء) بعض افسانے مثلاً "خوف" اخبار کے اس فکاہیہ کالم سے قریب نظر آتے ہیں' جن کا شمار ادب میں کیا جاتا ہے۔ مغربی ملکوں کی جدید صحافت نے اس روایت کو فروغ دیا ہے۔ "سلمیٰ خالہ" خطوط کے تسلسل سے مرتب ہوا ہے مگر اس کا کرشن چندر کے افسانوی مجموعے "نئے غلام" میں شامل "انکل سام کے نام خط" سے موازنہ نہیں کیا جاسکتا ہے۔ بین الاقوامی تعلقات اور بین العالمی سیاست کے حوالے سے "انکل سام کے نام خط" جس قدر تازہ سچا اور نیا پچاس کی دہائی میں تھا' اس سے کہیں زیادہ سچا اکیسویں صدی میں ثابت ہو گا۔ بانو ارشد کا مقابلہ پریم چند' منٹو' شوکت صدیقی اور قرۃ العین حیدر سے کرنا بھی نہیں چاہئے اور یقیناً' وہ خود بھی اسے زائد (excess) ہی سمجھیں گی۔

قیصر تمکین نے ان افسانوں پر جامعاتی ادب (campusfiction) کے اثرات کا ذکر کیا ہے مگر زیر نظر مجموعے کے تین چار افسانوں کے علاوہ دوسرے اس رجحان کی گواہی نہیں دیتے ہیں۔ جامعاتی ادب کوئی رجحان ہے بھی نہیں ورنہ اینگلو امریکی ادبی تاریخ میں اس کا ذکر اسی حوالے سے شامل ہوتا جیسے کہ کیمبرج' آکسفورڈ اور بلوزبری وغیرہ کا ہوا ہے۔ "پانوں کی ڈبیہ' خوف' ڈارلنگ' مغرب کی آزادیاں' وقت گزاری' سلمیٰ خالہ" وغیرہ کوئی جامعاتی ادب کے دائرے میں اس طرح نہیں آتے ہیں جیسے رشید احمد صدیقی علی گڑھ کی فضا میں دکھائی دیتے ہیں یا ایف آر لیوس (F.R. Leavis) اور کیمبرج لازم و ملزوم ہیں۔ رابعہ اور سعدیہ کی مڈبھیڑ اگر بہت زمانہ گزر جانے کے بعد ایک کلاس فیلو سے ہوتی بھی ہے اور پھر ماضی پلٹ کر زمانہ طالب علمی کی یادوں کو پھیلا دیتا ہے تو بھی اسے کیمپس فکشن سے متعلق کرنا صحیح نہ ہو گا۔ "پانوں کی ڈبیہ" میں تو ہمیں اودھ کی مٹ جانے والی تہذیب سانس لیتی ہوئی نظر آتی ہے بلکہ ایسے الفاظ مثلاً "گلوری' باکڑی' ٹکا دوپٹہ" بھی ملتے ہیں جو اب مردہ ہو گئے ہیں۔

اس قسم کی کہانیوں کے اندر مغرب کے ماحول سے مانوس خاتون افسانہ نگار کا ہندوستان آباد نظر آتا ہے۔ یہ فضا تو اس نسل کی ادبی تخلیقات میں بھی بہت کم ملتی ہے جو بعد آزادی یا آزادی سے ذرا پہلے پیدا ہوئی تھی اور ایک بالکل ہی بدلے ہوئے ماحول میں پلی بڑھی تھی۔ زیادہ تر کہانیاں **مثلاً** ''ڈارلنگ'، 'کٹی پتنگ'، 'مغرب کی آزادیاں'، 'وقت گزاری'، اور 'سلمٰی خالہ'' وغیرہ مغربی ماحول کے تناظر میں لکھی گئی ہیں اور ان مسائل کو نشان زد کرتی ہیں جو اجنبی دیس میں آباد ایشیائیوں کی پرانی اور نئی نسل کے ہیں۔ ان مسائل کا ہونا بالکل فطری عمل ہے۔ اپنی زمین ثقافت اور تاریخی محور چھوڑنے اور کسی بھی نئی دنیا میں جاکر بس جانے کے بعد لوگ اس پتھر کی طرح ہو جاتے ہیں جو ہوا میں پھینک دیا گیا ہو' اس لئے دسترس سے باہر ہو۔ انسان اپنی زمین' ثقافت اور تاریخ کے دائرے میں رہنے کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دے سکتا ہے۔ ایشیائی علاقوں کے تارکین وطن نے اقتصادی مفادات کو ترجیح دی اور باہر جاکر بس گئے۔ ان کی اولادیں جو باہر پیدا ہوئیں انہوں نے آنکھ کھول کر مغرب ہی کو دیکھا اور محسوس کیا۔ وہیں تعلیم و تربیت پائی جو ان کے شعور کا حصہ بنی۔ حقیقت یہی ہے کہ ایک اجنبی ماحول سے پہلے الجھنے اور پھر سمجھوتہ کرلینے ہی کا تاثر بانو ارشد کی بعض کہانیوں میں ابھرتا ہے۔ ثمینہ کو خیال آیا کہ اگر ''میرا دم بھی نکل جائے تو یہ لڑکیاں اپنی پارٹی نہیں چھوڑیں گی اور ہسپتال فون کریں گی کہ ان کو سردخانے میں رکھوا دو کل ہم لوگ ان کی لاش کو دفنا دیں گے۔'' اس کے باوجود ثمینہ نے حقیقت سے مفاہمت کی ''کمرے میں داخل ہوتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی کہ اس ملک میں آکر ایک ہی تو فائدہ ہوا ہے کہ اب ماں باپ کو لڑکے لڑکیوں کی فکر نہیں ہوتی کیونکہ یہ اپنی فکر خود ہی کرلیتی ہیں۔'' رہا معاملہ عزت و آبرو کے مشرقی تصور کا جو اب مشرق میں بھی بہت کمزور پڑگیا ہے تو دور جدید میں ٹیکنالوجی نے اس مسئلے کو حل کردیا ہے چنانچہ اب عشق بھی بے خطر آتش نمرود میں کود پڑا ہے اور بوائے یا گرل فرینڈ بھی کلچر کا حصہ بن گئے ہیں۔

بانو ارشد نے توہم پرستی اور مذہبی عقائد کے سائے میں رونما ہونے والے تصوراتی اور انسان دشمن رویوں پر طنزیہ انداز میں جو تیر برسائے ہیں' سب سے زیادہ قابل حوالہ ہیں مگر تعجب تو یہ ہے کہ اپنے اس مثبت موقف کی نشاندہی انہوں نے اپنی کہانیوں کے ذریعہ نہیں کی ہے۔ ان کا تعلق طبقہ نسواں سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے مغرب و مشرق کے سماجوں میں پلنے بڑھنے والی عورتوں ہی کو موضوع بنایا ہے۔ افسانوں کے مقابلے میں ان عنوانات پر

بھی زیادہ واضح نقطہ نظر انھوں نے اپنے بارے میں لکھتے ہوئے ظاہر کیا ہے‘ اس میں مغرب کے مختلف و متضاد فیمی نسٹ رجحانات کی کار فرمائی کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔ ان فیمی نسٹ رجحانات کی فہرست میں سب سے زیادہ مستند جامع اور عوام کی زندگی پر اثر انداز ہونے والا مکتبہ ء فکر ترقی پسند فیمی نسٹوں کی تازہ مثال ارن دتی رائے کا مغرب میں شائع ہونے والا پہلا ناول ہے جو ان دنوں امریکہ و انگلستان میں زیر بحث بھی ہے۔ (وی گاڈ آف اسمال تھینگس مطبوعہ فلیمنگو 1966ء) ترقی پسند فیمی نسٹ عورتوں کے مسائل و حقوق اور معاشرے پر مردوں کے تسلط کو الگ الگ خانوں میں بانٹنے کے قائل نہیں بلکہ ان کو رائج اقتصادی و سیاسی اور کاروباری نظام کی دین سمجھتے ہیں جو کہ ہے۔ اس رائج نظام کو ختم کر کے ایک دوسرے نظام کو رائج کرنا ہی ان کا حل ہے۔ اس سے ہٹ کر جتنے بھی فیمی نسٹ رجحانات ہیں‘ مسائل و مطالبات کی بات تو ضرور کرتے ہیں مگر ان کو حل کرنے کے لئے ایسی تجاویز پیش نہیں کرتے جو زہر کا تریاق ہوں۔ صرف بات کو کہتے رہنے سے جو شعور میں تبدیلی پیدا کر سکتی ہے۔ بنیادی مسائل و مطالبات حل نہیں ہوتے ہیں بلکہ ان کی شرح اور شدت میں وقت کے ساتھ اضافہ ہی ہوتا رہتا ہے۔ بانو ارشد کی فیمی نزم بھی عورتوں اور مردوں کے مابین فرق اور فاصلوں کے شعور کی نشاندہی کرتی ہے اور مردان کے یہاں بطور مجرم ظاہر ہوا ہے جو ہر جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ معاشرے میں یقیناً" یہی کردار ادا کرنے پر مجبور ہے۔ "طاقتور کون ہے" میں فوزیہ کا فرسٹریشن اور اس کا صرف ایک انتہائی اقدام جس کی نفسیاتی توجیہہ بھی کی جاسکتی ہے۔ اچانک مرد کے شعور میں انقلاب برپا کردیتا ہے۔ یہ ایک اتفاقی اور انفرادی بات ہی ہو سکتی ہے ورنہ اس قسم کے مرد شعوری طور پر اپنی بیویوں اور بچوں کے سر پھاڑ ڈالتے ہیں اور اپنے اس اقدام کو صحیح قرار دیتے ہیں۔ یہ تصور بھی محض فریب ہے کہ ہر مرد عورتوں کے مسائل و حقوق اور مرد مسلط سماج کی ستم کاریوں جیسے معاملے میں یا تو جانب داری یا پھر غیر جانب داری سے کام لیتا ہے۔ ایسے مردوں کا فقدان ہرگز نہیں ہے‘ جنھوں نے عورتوں کی جدوجہد اور ان کی تحریکات کے حق میں اپنا کردار ادا کیا ہے۔ ان کی فیمی نزم اس بین العالمی حقیقت سے فاصلہ رکھتی ہے جو مغرب کے سرمایہ دارانہ اور کاروباری کلچر کو تمام مسائل کا ذمہ دار قرار دیتی ہے اور جن کے زیر اثر عورتوں کے ایک حلقے نے آزادی مساوات اور آئینی حقوق کو جواز بنا کر کھیل کھیلنے کا مظاہرہ کیا ہے جو نہ صرف مغرب بلکہ اب ایشیائی ملکوں میں بھی بر سر عام ہے۔

افسانوی مجموعے "بانو کے افسانے" میں شامل کہانیوں کے اطراف ہلکی سی رومانی حقیقت پسندی کا ہالہ نظر آتا ہے، جس میں بیسویں صدی کی شروع چوتھائی صدی کے دوران پائی جانے والی زوال آمادہ تنقیدی حقیقت پسندی (critical realism) آن ملی ہے۔ ان افسانوں کی سماجی حقیقت نگاری بھی، جس کی داد و تحسین سے نظریں چرانے کا کوئی جواز نہیں ہے، رومانی اور تنقیدی حقیقت پسندی ہی کی وساطت سے ظاہر ہوئی ہے یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے نظریاتی اساس سے کٹی ہوئی "کٹی پتنگ" بن گئی ہے۔ اپنی کہانی کاری کے اگلے مرحلے میں اگر انہوں نے اپنی فنی و تخلیقی صلاحیت سے کام لیا، جس کی ان کے یہاں کمی نہیں ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ مغرب کے ماحول میں رہتے ہوئے وہ ایسا نہیں کریں گی تو اگلی بار اہل ادب اور قارئین کی ملاقات اس بانو ارشد سے ہوگی جس کے وہ منتظر ہیں۔

انور شیخ

بانو ارشد

محترمہ بانو ارشد یوں تو شاعر بھی ہیں لیکن انہوں نے مجھے اپنا افسانوی مجموعہ "بانو کے افسانے" تبصرہ کے لئے بھیجا ہے، اس لئے میں ان پر ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے ہی بحث کروں گا۔

بانو ارشد نہ صرف اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں بلکہ اکثر ممالک جہاں کی سیاحت کرچکی ہیں، اس لئے علم کے ساتھ دولت تجربہ سے بھی مالا مال ہیں۔ اگرچہ میں ان کی نجی زندگی کے متعلق کچھ نہیں جانتا لیکن ان کی ادبی کاوشوں سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے آئینہ حیات میں ایسی خوشگوار جھلکیاں کم ہیں، جن کی وہ مستحق تھیں۔ یہ بات اگرچہ بانو کے لئے باعث مسرت نہیں لیکن اردو ادب کے لئے وجہ تسکین ضرور ہے---- وہ اس لئے کہ بانو نے اپنی زندگی کے نشیب و فراز سے ہی ادبی عظمت کا راز سیکھا ہے، جسے چند الفاظ میں حقیقت نگاری کہا جاسکتا ہے۔

ادب کا تعلق زندگی کے ساتھ ہے۔ وہ ادب جو اس وصف سے ناآشنا ہو ادب کہلانے کا مستحق نہیں۔ ادب برائے ادب محض ایک بے معنی کہاوت ہے، جس طرح محض کھانے کے لئے کھانا کھایا نہیں جاتا بلکہ اس کا ایک مقصد یعنی بھوک مٹانا ہوتا ہے۔ اگر یہ اچھی طرح پکایا جائے تو اس میں ایک گوناں لذت پیدا ہوجاتی ہے جو اس کی شان کو بڑھا دیتی ہے، اسی طرح اگر فنکار کا انداز پیشکش بھی عمدہ ہو تو اس کے ادب کی عظمت بلند ہوجاتی ہے۔ ادب برائے ادب یعنی محض تفریح، طبع کے لئے ادب تخلیق کرنا وہی بات ہے جو لذت سے کھانے میں ہوتی ہے، لٰہذا ادب برائے زندگی اور ادب برائے ادب کی بحث مصنوعی ہے کیونکہ ادب وہی ہے جس کا تعلق زندگی کے ساتھ ہو اور جس میں فنی مہارت سے تفریح طبع کا سامان پیدا کیا

گیا ہو۔

یہ بات باعث مسرت ہے کہ بانو کا ادب اسی خاصیت کا حامل ہے۔ اس کا تعلق زندگی سے ہے اور اس میں ادبی لذت بھی موجود ہے' جو اسلوب بیان سے پیدا ہوتی ہے۔ بانو کی عبارت صرف سلیس اور صاف ستھری ہی نہیں بلکہ اس میں ایسا جادو ہے جو قاری کو عام دنیا سے اٹھا کر عالم انسانیت میں لے جاتا ہے اور عورت محض بچے جننے والی مشین نظر نہیں آتی۔ وہ ایک انسان دکھائی دیتی ہے جو مساوی حقوق کی حقدار ہے اور جس میں باعزت زندگی بسر کرنے کا ارمان انگڑائیاں لیتا نظر آتا ہے اور وہ اپنی انفرادیت کا سکہ منوانے کے لئے مکرو فریب کا سہارا نہیں لیتی بلکہ اپنی نزاکت' لطافت اور شرافت کو ہی اپنی قوت کا ذریعہ سمجھتی ہے۔ اس کی نگاہ ایک تیر سے مشابہ ہو جاتی ہے اور اس کی ہر ادا شمشیر کا روپ دھار لیتی ہے لیکن اس کے باوجود مرد کے لئے ایک جنسی تحفہ نہیں بلکہ ایک جیتا جاگتا انسان ہے۔ جس کی عظمت کا راز مساوات' حقوق اور ان کے حصول میں مضمر ہے۔

افسانہ نگاری کے کئی طریقے ہیں لیکن مجھے یہاں صرف بانو ارشد کے طرز تحریر سے سروکار ہے۔ ان کے لکھنے کا ڈھنگ بیانیہ ہے جو ایک فنکار کہانی کی شکل میں پیش کرتا ہے' جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بات سے بات نہیں نکلتی یعنی اس میں علت اور فعل کی نسبت پیدا نہیں ہوتی بلکہ بیان کی روانی کا انحصار لکھنے والے کے موڈ اور مقصد پر ہوتا ہے۔ ایسا فنکار ایک مقرر کے مانند ہے جو حقائق کو اس ترتیب سے پیش کرنے کا پابند نہیں ہوتا جس سے وہ رونما ہوئے ہوں بلکہ ایسے انداز میں ظاہر کرتا ہے جو اسے موثر بنانے میں ممد ثابت ہوں۔ بیانیہ افسانہ نویسی کے عیوب و محاسن کو اجاگر کرنے کے لئے نہ صرف پلاٹ کی تدوین کا جائزہ لینا ضروری ہوتا ہے بلکہ یہ دیکھنا بھی لازم ہوتا ہے کہ فنکار نے اپنے افسانے کی ابتداء اور انتہا کیسے کی ہے اور اپنے مقصد کے حصول کی خاطر کن باتوں پر زور دیا ہے اور کن باتوں کو سرسری انداز میں بیان کیا ہے۔ اس سلسلے میں اس کو زبان پر جو قدرت حاصل ہو اسے خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس مختصر خاکے میں بانو کے افسانوں پر تکنیکی بحث ممکن نہیں' صرف تاثراتی جائزہ ہی پیش کیا جاسکتا ہے۔

افسانے کی ایک خاصیت یہ ہے کہ اس کی بنا "کہانی پن" پر ہوتی ہے۔ باالفاظ دیگر افسانہ

ایک فرضی کہانی ہے' لہٰذا کہانی پن کے بغیر کوئی ادبی نوشتہ افسانہ نہیں کہلا سکتا۔ بانو کا ہر افسانہ اس خوبی سے مزین ہے جو انہیں افسانہ نگاروں کی صف میں کھڑا ہونے کا اعزاز عطا کرتا ہے لیکن ان کے افسانے طوطا مینا کی کہانیاں نہیں' اصلی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوی کردار حقیقت کے غماز ہیں اور اس بات کا احساس دلاتے ہیں کہ بانو کی فنکاری لفاظی کی حدود کو پھاند کر ریگزار حقیقت میں جادہ پیمائی کر رہی ہیں۔ دراصل افسانہ نگاری کی تکنیک یہی ہے جس پر میں نے اپنی کتاب "سوز و ساز" میں بحث کی ہے۔ اس کا لب لباب یہ ہے کہ حقیقت اس قدر تلخ ہے کہ زندگی کو عذاب بنا دیتی ہے' اسے خوشگوار بنانے کے لئے رعنائی خیال کی اشد ضرورت ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہر شے اپنے معکوس سے پہچانی جاتی ہے۔ **مثلاً**" مٹھاس کی شناخت تلخی اور روشنی کی ظلمت کے بغیر ممکن نہیں۔ اسی طرح حقیقت اور خیال بھی ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ افسانہ نگاری حقیقت کی تلخیوں کو اس طرح بیان کرنے کا نام ہے کہ رنگینی خیال سے زندگی میں نکھار پیدا ہونے لگے اور جیون اگر موسم گل نہ بھی بن سکے تو کم از کم امید بہار کا قاصد ضرور نظر آئے۔

بانو ارشد کے افسانوں میں امید کی جھلک نظر آتی ہے۔ ان میں کوئی تعلی یا مبالغہ نہیں۔ ہر بات فرضی ہونے کے باوجود روزمرہ زندگی کا حصہ ہے' اسی لئے ان میں فوق الفطرت واقعات کا فقدان ہے۔ بانو کے افسانوی کردار نہ تو تقدیر کے شکنجے میں جکڑے ہوئے نظر آتے ہیں اور نہ ہی اوہام پرستی کے نشے میں غرق دکھائی دیتے ہیں۔ غالباً" اس کی وجہ بانو کی آزاد خیالی ہے اور یہی اس کی فطری افسانہ نگار ہونے کی دلیل ہے۔

آزاد خیال وہی ہو سکتے ہیں' جن کے اذہان مذہبی شدت کی ستم رانیوں سے بری ہوں۔ ایسے ہی لوگ ادب کے سچے تخلیق کار ہیں کیونکہ ادب کا تعلق زندگی کے نشیب و فراز سے ہے نہ کہ مذہب اور اوہام پرستی کے ساتھ۔ زندگی پر سب سے بڑا اثر سماجی روایات کا ہے جو فرد اور سوسائٹی کے عادات و اطوار اور مقصد حیات کی تشکیل کرتی ہیں۔ ہر فرد کا سب سے بڑا جذبہ شخصی آزادی ہے اور انسان کی یہ روش سوسائٹی کے چلن کا حصہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آمرانہ چیرہ دستیوں کے باوجود انسان کا جذبہ آزادی رواں دواں ہے۔

ادب کا تعلق سماج کے ساتھ ہے' مذہب سے نہیں۔ البتہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ

سماج بذات خود خارجی کیفیات سے متاثر ہوتا ہے اور یہ کیفیات معاشی' اقتصادی' سیاسی' صنعتی اور تاریخی ہو سکتی ہیں۔ مذہب بھی ان عوامل میں ایک ہے۔ یہ سماجی روایات کا ایک جزو بن کر ادب پر اثر انداز ہو سکتا ہے لیکن اس کے باوجود "مذہبی ادب" ایک غلط اصطلاح ہے کیونکہ جب کسی معاشرے میں مذہب کا بول بالا ہو تو وہ پھر بھی سماجی روایات کا حصہ بن کر ہی تخلیقی ادب پر اثر انداز ہوتا ہے براہ راست نہیں۔

اگرچہ میں بانو ارشد کے مذہبی عقائد سے واقف نہیں۔ ان کے افسانوں سے ان کی طبعی آزاد خیالی اور جدت طرازی ٹپکتی ہے اور یہی ان کے ایک کامیاب افسانہ نگار ہونے کا سبب ہے۔

شاہدہ احمد

بانو کے افسانے

میں بانو کو ان کی پہلی کتاب کی اشاعت کے ساتھ ساتھ آج کی اس خوبصورت تقریب کے انعقاد پر بھی مبارکباد پیش کرتی ہوں۔ اس کے علاوہ تقریب کی سرپرستی کرنے والی تنظیموں اور افراد کو بھی اس کاوش پر مبارکباد پیش کرتی ہوں۔

خواتین و حضرات!

حضرت انسان کا ذہن بہت ہی فتنہ پرور ہے۔ اب یہ کوئی بات ہے کہ کسی دلچسپ حوالے خوبصورت تشبیہ یا علمی استعارے کے بجائے دماغ میں یہ بیہودہ سرگوشی شور مچائے رہے کہ نئی چھپنے والی کتابیں وہ دوشیزائیں ہوتی ہیں جن کی قبولیت بڑھانے کے لئے ان کی تعارفی تقریبات کے موقع پر مضامین پڑھنے والوں کا کام مشاطاؤں جیسا ہوتا ہے یعنی ہر خامی پر پردہ ڈال کر آنکھ چرا کر چن چن کر گن گن کر ڈھنگ اور سبھاؤ کچھ اس طرح پیش کرنا کہ محفل میں شریک ہر فرد کا جی بنا پڑھے کتاب کو اپنی شیلف کی زینت بنالینے پر مچل اٹھے (لفظ مشاطہ کی زد چونکہ براہ راست feminism پر پڑ رہی ہے اس لئے وضاحت ضروری ہے کہ میرج بیورو کے کاروبار میں آجکل خواتین سے زیادہ حضرات شریک ہیں۔)

مگروائے ہماری روایتیں' ہمارے رسم و رواج مصنف بیچارہ یا بیچاری ابھی تعریفی مضامین کے سحر سے باہر نہیں آنے پاتا کہ وہی کتاب رونمائی کی تقریب میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر جس کے محاسن بیان کئے جاتے ہیں ناقد کے ہاتھ میں پہنچ جاتی ہے اور کھیر روٹی چھوانے کی رسم کے بعد نئی نویلی دلہن کی طرح بین بین کر کتاب کے عیوب گنوانے کی شروعات ہو جاتی ہے اور تقریب اجرا کے موقع پر خوشنما پرندہ کہہ کر متعارف کرائی جانے والی کتاب کے ساتھ بدصورت بطخیے کا سا سلوک روا ہو جاتا ہے......یہی نہیں بلکہ اکثر مظلوموں کے ساتھ تو یہ بھی ہوتا ہے کہ (گرامر کی غلطی معاف ہو) بعض ادبی مشاطے اور اور مشاطائیں غضب کے شاطر

ثابت ہوتے ہیں یعنی آتے ہیں تعریفی مضمون پڑھنے کا جھانسہ دے کر اور گرو دکھشا کی طرح مضمون دکھشا کے طور پر صاحب کتاب کے انگوٹھے پر تو کیا پوری محنت پر ہاتھ صاف کر جاتے ہیں۔

میں خوش' میرا خدا خوش کہ میرا شمار محاسن کی نشاندہی کرنے والوں میں ہے..... کمی بیشی کی پکڑ ناقدین کا کام ہے' لہٰذا جس کا کام اسی کو ساجھے۔ ویسے بھی اس چترپن کے بغیر ہی اللہ رکھے شہر میں خود سے خفا لوگوں کی کمی نہیں۔ علاوہ اس کے کوئی کتاب ماسوا آسمانی صحیفوں کے خامی سے مبرا نہیں جبکہ کرنے والے تو ان پر بھی ہاتھ کی صفائی کا موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔

بانو کے افسانے جیسا آسان اور سیدھا سادہ کتاب کا عنوان ہے' ویسی ہی صاف ستھری الجھاؤں اور بھاری بھرکم الفاظ سے پاک اس کی تحریریں ہیں----لہجہ مدھم اور شائستہ۔

چھوٹے چھوٹے جذبے' چھوٹے چھوٹے محسوسات' جن کے بغیر انسان مکمل نہیں' ان افسانوں کا اثاثہ ہیں۔ ماں باپ' بہن بھائی' شوہر بیوی' اولاد' محبوب دوست' دشمن ہر وہ انسانی رشتہ اور تعلق جو بادشاہ سے فقیر تک کی زندگی کا اساس ہے۔ بانو کے افسانے انہیں تعلقات کی ڈور میں پروئے ہوئے ہیں۔ گوئٹے کا کہنا ہے کہ کوئی بھی انسانی واقعہ اگر مناسب ڈھنگ سے کچھ بنا سنوار کر کچھ طرز ادا کے طور پر اختصار کے ساتھ پیش کیا جائے تو مختصر کہانی کہا جاسکتا ہے۔ بانو کے افسانے یہی انسانی واقعات ہیں' جن میں زندگی کی رفاقت کا احساس ہے۔ ان افسانوں میں طلاطم یا مسپنس کی فضا نہیں مگر ان میں انسان کے فطری المیوں کو واضح طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔ ان افسانوں کا مسلک طرف داری کا سا تو نہیں لیکن ان میں عورت کی مظلومیت اور حق خواہی کی تصویریں جگہ جگہ ملتی ہیں۔

افسانہ نگار اپنی ذات میں تنہائی کا شکار ہو تو بھی اپنے آپ کو اکیلا نہیں سمجھتا کہ دوسروں کے دکھ میں شرکت اس کا منصب ہے لیکن یہ اس قدر آسان بھی نہیں اپنے اندر لہولہان ہونا پڑتا ہے۔ تب غم دل غم دوراں کا روپ دھارتا ہے اور افسانوں میں کئی زاویوں اور کئی رنگوں میں جہاں تہاں نظر آتا ہے۔ بانو کے افسانے کی مصنفہ کے مزاج کی جھلک ڈارلنگ کی عنبریں اور فکر ننھی مفکر میں محسوس کی جاسکتی ہے۔

ننھی مفکر میں موت و حیات جیسے الجھے ہوئے موضوع کو انہوں نے بڑی سہولت کے ساتھ برتا ہے۔ خصوصاً" بچی کی معصوم سوچ کو جس طرح بچی کی ذہنی سطح پر اتر کر گرفت میں لیا ہے۔ اس نے موضوع کی گھمبیرتا کو شگفتگی کا پیراہن عطا کیا ہے۔ اس کہانی میں زندگی کے

سفاک سوال بڑی معصومیت سے دہرائے گئے ہیں۔

اس کے علاوہ ہمارے معاشرے کی ہر دوسری لڑکی بانو کے افسانے کٹی پتنگ کی سعدیہ ہے، جس کی زندگی میں ایسا لمحہ روکے سے نہیں رکتا' جب وہ خود کو ایسی کٹی پتنگ سمجھنے پر مجبور ہو جاتی ہے جسے کاٹتا کوئی اور ہے اور لوٹتا کوئی اور..... اسی طرح غربت و تنگ دستی سے نجات کے عوض خوشحالی کی چار دیواری میں چن جانے والی انار کلی کی نزہت اور اس کی ساس بھی قاری کے لئے کوئی غیر مانوس کردار نہیں۔ طبقاتی تفریق کے احساس کمتری میں قید ایسی نجانے کتنی انار کلیوں سے قدم قدم پر مڈ بھیڑ ہوتی ہے۔ مشرق کا حسن اس کا اسرار وہ پردہ ہے جو معاشرتی سچائیوں اور تہذیبی حقائق کے دوہرے معیار زندگی کو اپنی اوٹ میں لئے رہتا ہے ورنہ کھجوائے کی تہذیب پر سے گھونگٹ سرکتا ہے تو مغرب دنگ رہ جاتا ہے مگر یہاں بھی سچائی کو اس کے حقیقی روپ میں قبول کرنے کے بجائے خجالت سے بچنے کے لئے مشرق یہ کہہ کر جھوٹ کی ڈنڈی مارنے سے نہیں چوکتا کہ یہ تو دور جہالت کا عکس ہے۔ پانوں کی ڈبیہ اسرار کی دھند میں اوجھل ایک ایسی ہی تیکھی کہانی ہے، جس میں نہ صرف ایک پوری تہذیب اور طرز معاشرت سانس لے رہی ہے بلکہ اس میں اس تہذیب کا وہ پہلو بھی دھڑک رہا ہے جو سماجی واخلاقی مزاج کا ایک عام حصہ ہونے کے باوجود بمشکل تسلیم کیا جاتا ہے۔

ان کے افسانے ننھی مفکر کے دو ٹکڑے جو مجھے بہت اچھے لگے یقیناً" آپ کو بھی بھلے لگیں گے۔

"مجھے اللہ میاں بالکل اچھے نہیں لگے جیسے مجھے بھیا بھی اچھے نہیں لگتے جو میرا غبارہ چھین لیتے ہیں اور پھر پھوڑ دیتے ہیں۔ ابا جان جب میں مرجاؤں گی تو خود ان سے پوچھوں گی انہوں نے یہ دنیا کیوں بنائی ہے....؟ اپنے کھیلنے کے لئے؟"

اسی کہانی کا ایک اور بہت بے ساختہ اور بے حد رواں مکالمہ ملاحظہ فرمائیے!

"امی انتقال کسے کہتے ہیں؟ منی نے معصومیت سے پوچھا۔

"ارے چپ بیٹھ کمبخت یہ سب ابھی پوچھے گی گھر چل کر پوچھنا... چلو کلمہ پڑھو اور بسم اللہ"

منی سوچنے لگی "اے لو یہاں تو سب رو رہے ہیں اور یہ مجھے یہاں بھی آموختہ دہروانے لگیں؟"

چلتے چلتے یہ بھی کہتی چلوں کہ مجھے خوشی ہے کہ آج بانو ارشد کی پہچان بانو کے افسانے ہے اور لوگوں کے پاس ان کی ذاتی حیثیت کے حوالے کے بجائے شوکت تھانوی کی بھانجی کے طنز کا جو ہتھیار تھا وہ کند ہو گیا ہے۔

نجمہ خان

بانو کے افسانے

بانو ارشد برصغیر کے ایک معروف علمی و ادبی خانوادے سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس حوالے سے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ادبی ذوق انہیں ورثے میں ملا ہے۔ ان کے شعور کی تہذیب و تربیت میں ان کے گھرانے کا کردار اہم ہے۔ وہ ایک دردمند دل کے ساتھ سوچنے والا ذہن رکھتی ہیں۔ وہ خود کو گردوپیش سے باخبر ہی نہیں رکھتیں بلکہ ان کا گہرا مطالعہ اور وسیع مشاہدہ ان کے مشاغل حیات میں شامل ہے۔ وہ ایک عرصے سے برطانیہ میں مقیم ہیں اور شعبہ درس و تدریس سے وابستہ ہیں۔ لوح و قلم سے ان کا رشتہ دیرینہ ہے اور اس طرح پرورش لوح و قلم ان کا کل وقتی شغل ہے۔ ادب سے وابستہ افراد کا شعبہ درس و تدریس سے پیشہ ورانہ تعلق میرے نزدیک ایک previlege ہے۔ میں بانو ارشد کو اس ضمن میں رشک کی نگاہ سے دیکھتی ہوں کیونکہ میری پیشہ ورانہ مصروفیتوں اور فرائض منصبی کا ادب سے دور کا واسطہ بھی نہیں ہے بلکہ اپنے تقاضوں اور اہداف کے اعتبار سے بھی دونوں ایک دوسرے سے متصادم اور متضاد کہے جاسکتے ہیں۔ مجھ جیسے اور بہت سے افراد اس حوالے سے بانو ارشد سے رشک کرنے کا استحقاق رکھتے ہیں۔ بہرحال بانو ارشد نے اس previlege سے استفادہ کرنے کا ایک اہم ثبوت اپنے افسانوں کے زیر نظر مجموعے کے ذریعے پیش کردیا ہے۔

بانو ارشد کو کتابوں سے زیادہ زندگی کو سمجھنے کا موقع خود زندگی نے فراہم کیا۔ وہ ایک عرصے سے دیار مغرب میں مقیم ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے کرہ ارض کے بیشتر ممالک کا دورہ کیا ہے جن میں ایشیائی' افریقی اور یورپی ممالک کے علاوہ امریکہ' کینیڈا شامل ہیں۔ مشاہدہ عالم سے ایک صاحب بصیرت فرد کی بصارت اور بصیرت میں جو تنوع پیدا ہوتا ہے اس سے شاید کسی کو انکار کی جسارت نہ ہو۔ بانو ارشد نے دنیا کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ مختلف تہذیبوں اور ثقافتوں کی اشکال ان کی نگاہوں میں محفوظ ہیں۔ مغربی تہذیب بلاشبہ

اپنے سائنسی اور تیکنیکی حوالے سے آج dominent culture کہلانے کا حق رکھتی ہے اور آج ساری دنیا اس سے مرعوب و متاثر ہے مگر یہ دائمی phase نہیں ہے بلکہ تاریخ کا ایک passing phase ہے۔ اس کے ساتھ یہ حقیقت بھی روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ کرہ ارض سائنس اور تیکنیکی کمالات اور معجزات کی بدولت ایک global village بن چکا ہے۔ ایسے حالات میں وہ لوگ جو اپنے تہذیبی ورثے کی طرف سے منہ موڑنے کے بجائے اس کے تحفظ کے لئے فکرمند اور کوشاں ہیں' وہ بے شک قابل تحسین ہیں۔ بانو ارشد اس قبیلے سے تعلق رکھتی ہیں جسے اپنا تہذیبی ورثہ بہت عزیز ہے۔ بانو ارشد کے افسانوں میں ہمیں یہ کرب جگہ جگہ ملتا ہے۔ اخلاقی اقدار و روایات کی شکست و ریخت کا احساس انہیں مادی آسائشوں میں کھو جانے سے باز ہی نہیں رکھتا بلکہ ایک کرب مسلسل میں مبتلا رکھتا ہے۔

یہ بات باعث اطمینان ہے کہ امریکہ' کینیڈا اور یورپ میں بس جانے والے اہل قلم نے اپنا تخلیقی سفر جاری رکھا ہے اور سمت سفر کے سلسلے میں وہ کسی کج روی یا گمرہی کا شکار نہیں ہیں۔ ان اہل قلم میں شعراء کی تعداد کے مقابلے میں افسانہ نگاروں کی تعداد یقیناً" کم ہے لیکن یہ تعداد پھر بھی مایوس کن نہیں کہی جاسکتی۔ مغرب میں اردو افسانہ نگاروں میں بعض بہت اہم نام ہیں جن کا شمار آج کے مقتدر اور معتبر افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان میں خواتین اہل قلم کی فہرست بھی شامل ہے جن کی تحریر آج توجہ سے پڑھی جاتی ہیں۔ ان اہل قلم خواتین و حضرات میں بیشتر کشمکش و کشاکش میں مبتلا ہیں۔ وہ کشمکش کہیں nostalgia کی دین ہے اور کہیں تصادم تہذیبی اقدار و روایات کی کرشمہ سازی کی۔ دیار غیر میں مقیم اہل قلم میں اپنے تہذیبی ورثے اور ثقافتی اثاثے کیلئے ایک تڑپ پائی جاتی ہے۔ یہ تڑپ ان کی تحریروں میں وہ کرب و سوز پیدا کردیتی ہے جو ادب کی جان اور کرب ٹھہرتے ہیں۔ بانو کے افسانے بھی اس کرب و سوز سے مالامال ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بانو کے افسانوں میں وہ تاثر اور اثر پذیری ہے جو انہیں قابل مطالعہ بھی بناتے ہیں اور ارباب نقد و نظر کی توجہ بھی اپنی جانب مبذول کراتے ہیں۔

بانو کے افسانے دیار مغرب میں پائی جانے والی حسیت اور طرز احساس سے قریب بھی ہیں اور دور بھی۔ قربت کی حدیں اس زندگی سے استوار ہیں جن سے وہاں کے اہل قلم دوچار ہیں۔ ان کے یہاں abstraction کے بجائے حقیقت نگاری پائی جاتی ہے۔ بانو ارشد بڑی سادگی سے اپنی باتیں کہنے پر گامزن ہیں۔ ان کے افسانوں میں بیان کی سادگی ان کا نمایاں وصف ٹھہرتا ہے۔ یہ سادگی' خلوص و صداقت سے عبارت ہے۔ انہوں نے اپنے افسانوں

میں جن مسائل زیست کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے وہ اس کوشش میں کامیاب کہی جانے کی مستحق ہیں۔ اپنے افسانوں میں انہوں نے پہیلیاں بیان نہیں کی ہیں بلکہ زندگی کی سچی تصویر کشی کی ہے۔ یہ تصویر کشی قابل دید بھی ہے اور قابل تحسین بھی۔ ان کے مجموعے تمام افسانے جن کی تعداد 21 ہے۔ وہ متضاد اور متصادم لہریں اور کیفیات نہیں رکھتے بلکہ ان میں ایک مانوس سی فضا پائی جاتی ہے۔ خلوص' سچائی اور سادگی کی فضا' بانو ارشد کی نگارشات میں وہ در و بست نہیں ہے جو بناوٹ اور تصنع کے بغیر ممکن نہیں۔ بناوٹ اور تصنع ادبی تحریروں میں ہنر نہیں میرے نزدیک عیب ہے اور بے ہنری کو چھپانے کے مترادف عمل ہے سو بانو کے افسانے اس عیب سے محفوظ ہیں۔

بانو ارشد کے افسانوں کا مطالعہ قارئین کے لئے کسی امتحان یا آزمائش سے گزرنے کا متقاضی نہیں بلکہ ان افسانوں کا مطالعہ قاری کے لئے ایک خوشگوار سفر ہوتا ہے کیونکہ ان افسانوں میں قاری کے لئے دلچسپی کا پورا پورا التزام رکھا گیا ہے۔ یعنی ان افسانوں میں ایک پلاٹ ہے' ایک کہانی ہے۔ یہاں یہ ذکر بے محل نہیں ہوگا کہ گذشتہ ربع صدی کے عرصے میں افسانہ اپنے قاری سے دور بلکہ محروم ہوتا گیا۔ اس کا بنیادی سبب افسانے سے کہانی کا رفتہ رفتہ ناپید ہونا اور علامتی افسانوں کا ناقابل فہم ہونا تھا۔ ساٹھ کی دہائی کے آغاز سے جدیدیت کی تحریک کے رجحان کے زیر اثر افسانے کا ایک ایسا سفر شروع ہوا جو دو عشروں میں اردو افسانے کو ایک ایسی سرنگ کی سمت لے گیا جس کے دوسرے سرے پر روشنی معدوم تھی۔ اپنے قاری سے کٹ کر کوئی صنف ادب اپنے زندہ رہنے کا نہ تو ثبوت پیش کر سکتی ہے اور نہ جواز' اس میں شک نہیں کہ افسانہ ہمارے ہاں مغرب سے مستعار ہے مگر اس کے ڈانڈے داستان سے ملتے ہیں۔ داستان انیسویں صدی تک ہمارے زبان و ادب میں ایک اہم اور مقبول صنف رہی ہے۔ اس کے اثرات سے بیگانہ ہونا گویا اپنے ورثے سے بیگانگی برتنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب تک افسانے میں کہانی کی کلیدی حیثیت رہی افسانہ ایک توانا اور مقبول عام صنف ادب رہا۔ بیسویں صدی میں افسانے کا عروج و زوال میرے خیال میں کہانی کے ہونے نہ ہونے کی کہانی ہے۔ یہ بات باعث مسرت ہے کہ گذشتہ عشرے کے دوران اہل ادب نے کہانی کی کمی کو شدت سے محسوس کرتے ہوئے اس کی واپسی کی جانب توجہ دی۔ افسانے میں کہانی کی واپسی کے ساتھ ہی افسانہ اپنے قارئین سے قریب ہوگیا۔ بانو کے افسانوں میں کہانی کی موجودگی سے انکار ممکن نہیں۔ ان کے ہر افسانے میں کوئی نہ کوئی کہانی موجود ہے لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ ان افسانوں میں پائی جانے والی کہانیاں' افسانے کہاں تک

بن پائے ہیں۔ بہرحال یہ بات باعث طمانیت ہے کہ بانو ارشد نے افسانے میں کہانی کی اہمیت اور افادیت کا پورا پورا خیال رکھا ہے۔

"بانو کے افسانے" صرف نام کے بانو کے افسانے نہیں ہیں بلکہ ان افسانوں میں عورت کے طرز احساس اور عورت کی نفسیات سے پیدا ہونے والی **حسیت**(sensibility) کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔ ان موضوعات پر اس قسم کے افسانے اگر کوئی مرد افسانہ نگار تحریر کرتا تو اس کا اظہار اس طور پر ہرگز نہیں ہوتا جو اظہار ہمیں بانو کے افسانوں میں ملتا ہے۔ بانو ارشد کا لب و لہجہ ایک خاتون کا فطری لب و لہجہ ہے ان افسانوں میں وہ اپنی بات کہنے میں کہیں ناکام نظر نہیں آتیں بلکہ ان کے قاری تک وہ بات پوری صحت اور جامعیت کے ساتھ پہنچتی ہے جو وہ پہنچانا چاہتی ہیں۔ بانو ارشد اپنے افسانوں میں کہیں confused اور **بھول بھلیوں** میں گم نظر نہیں آتیں بلکہ ان کی شخصیت کے نقوش ہر مقام پر واضح اور تابندہ نظر آتے ہیں۔ وہ تمام تر سادگی اور خلوص نیت کے باوجود اپنے افسانوں میں مبلغ اور مصلح کا روپ دھارتی ہوئی نظر نہیں آتیں بلکہ ہمیشہ ایک فنکار ہی نظر آتی ہیں جس کا کام زندگی کی ترجمانی اور تفہیم ہے۔ وعظ و نصیحت کرنا نہیں زندگی کی تصویر کشی اس طرح کرنا ادیب کا کام ہے جس سے اس کے حسن قبح نمایاں ہو جائیں اور بس۔ سو بانو کے افسانے ادب کے اس معیار پر پورے اترتے ہیں۔

میں اصناف ادب میں افسانہ پڑھتی ضرور ہوں اور افسانے کی قدر و قیمت بھی مجھ پر پوری طور پر منکشف ہے لیکن میں افسانے کی تنقید لکھنے کی نہ تو دعویدار ہوں اور نہ اسے اپنا منصب خیال کرتی ہوں۔ تاہم "بانو کے افسانے" میں نے پڑھے' میری سمجھ میں آئے اور مجھے اچھے بھی لگے۔ سارے افسانوں کا مطالعہ اس لئے بھی ممکن ہوا کہ ان میں طوالت نہیں ہے بلکہ تمام افسانے ہی مختصر ہیں۔ میرا احساس یہ ہے کہ بانو ارشد کا تخلیقی سفر ایک عرصے سے جاری و ساری رہنے کے باوجود اسے ابھی بڑے فاصلے درپیش ہیں مگر بانو ارشد کے یہاں مجھے جو خلوص و سادگی نظر آتی ہے' اس حوالے سے یہ بات کہنے میں مجھے چنداں تامل نہیں کہ بانو مستقبل میں روشن امکانات کے افسانے تحریر کریں گی اور اپنی محنت اور لگن سے افسانہ نگاروں کے قبیلے میں ایک معتبر مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گی۔ میں انہیں اس کتاب کی تقریب اجرا کے موقع پر تہہ دل سے مبارک باد پیش کرتی ہوں۔

اوج کمال

لمحہ موجود کی افسانہ نگار

مشتاق احمد یوسفی ''آب گم'' میں تحریر کرتے ہیں کہ ''برطانیہ میں رہنے والے ایشیائیوں میں سو میں سے ننانوے ان خوبصورت درختوں کے نام نہیں بتا سکتے جو ان کے مکانوں کے سامنے نہ جانے کب سے کھڑے ہیں، رہا سوواں آدمی سو اس نے درخت کا کبھی نوٹس نہیں لیا''

مشتاق احمد یوسفی صاحب نے ایک عالم کو برطانیہ میں مقیم ایشیائیوں کی بے حسی کو علامتی انداز میں اس خوبی سے بیان کیا ہے کہ بقول شخصے ''ان کی بھی عزت رہ گئی اپنا بھی کام ہوگیا'' تاہم جو چوٹ انہوں نے اپنی آڑ میں صاحبان علم و دانش پر کی ہے وہ بلاشبہ قابل غور ہے۔

بڑے آدمیوں کے مسائل بھی عجیب اور دلچسپ ہوتے ہیں۔ ادھر پاکستان میں ادب کے جید کسی بھی نابالغ اردو کو مستقبل گردانتے میں ذرا بھی کنجوسی کا مظاہرہ نہیں کرتے اور ادھر بھارت میں اساتذہ فن کسی بھی نوزائیدہ ادب سے ملنے کو افتخار سمجھتے ہیں۔ وہ تو اللہ بھلا کرے.... معین الدین شاہ، ساقی فاروقی، بخش لائلپوری، مقصود الٰہی شیخ، عاشور کاظمی، منصور معجز اطہر راز، عمران الارشد، رضا علی عابدی، قیصر تمکین، بانو ارشد، حضرت شاہ، عقیل دانش، نورجہاں نوری اور دیگر ادبی شخصیات کا کہ جنہوں نے برطانیہ کے مختلف خطوں میں رہ کر بنا کسی تعصب کے لندن کو دبستان کا درجہ بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔

''بانو کے افسانے'' کی اشاعت کے بعد لندن پلٹ خیر خواہوں کو اپنی رائے میں یقیناً ترمیم کرنی چاہئے، جنہوں نے مغرب میں ایشیائیوں کے مسائل کو نہایت خوبی سے قلمبند کیا ہے۔ انہوں نے مشرق اور مغرب کے اچھے اور برے پہلوؤں کو دلیری سے بیان کیا ہے، جس

کی میں انہیں مبارکباد دیتا ہوں۔

صاحبو! افسانے میں علامتی افسانہ آجانے سے جہاں فکر کے مختلف پہلوؤں کو جلا مل رہی ہے وہاں ایک بہت بڑا نقصان' افسانے کی رفتہ رفتہ موت کی صورت میں ہو رہا ہے۔ بانو ارشد صاحبہ نے علامتی افسانے کے ذریعے افسانے کی عمر گھٹانے میں اپنا کردار ادا نہیں کیا بلکہ عام فہم الفاظ میں ابلاغ کا عمل مکمل کرتے ہوئے افسانے کی لاج رکھی اور حیرت انگیز طور پر قارئین کو افسانے کے قریب لانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ موجودہ صورتحال میں ادب محض ادیب اور افسانہ برائے افسانہ نگار کے لئے ہو گیا ہے۔ میرے مشاہدے اور قارئین دنیائے ادب کی آراء کے مطابق افسانے کا رفتہ رفتہ زوال علامتی افسانوں کی بہتات اور جدت خیالات کے نہ ہونے کی وجہ سے ہے۔

بانو ارشد صاحبہ نے افسانوں کے عنوانات بھی اس طرح منتخب کئے ہیں کہ مشرق کا ترسا ہوا اچھا بھلا آدمی بھی انہیں پڑھنے پر مجبور ہو جاتا ہے **مثلاً**---- "ڈارلنگ' کٹی پتنگ' مغرب کی آزادیاں' معصوم گناہ' وقت گزاری اور بے بس" تاہم حیرت انگیز طور پر قاری ان کے افسانوں میں گرفتار ہوتا جاتا ہے اور وہ جلد از جلد افسانے کے ممکنہ نتائج کے حصول کا خواہشمند رہتا ہے۔

بانو ارشد صاحبہ کے افسانے میں---- برصغیر کے لوگوں کے رسم و رواج' رہن سہن' روایات اور گھریلو معاملات پر زیادہ discuss کیا گیا ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے گرد ان معاملات کا ایک حصار سا باندھا ہوا ہے' جس سے باہر نکلنا ان کے بس میں نہیں ہے۔ وہ برسوں سے لندن میں آباد رہتے ہوئے بھی ایشیائی ہیں۔ ان کے بیشتر افسانے انہی معاملات کے گرد گھومتے نظر آتے ہیں **مثلاً** "شادی بیاہ' محبت' عشق' علیحدگی' اور دوسری شادی" جیسے موضوعات اوروں کی طرح ان کے پاس بھی ہیں لیکن جو بات انہیں دیگر مصنفوں سے ممتاز کرتی ہے' وہ "عورت کی بقا' جنگ' حقوق کا حصول' اور بیداری نسواں" جیسے موضوعات ہیں۔

"شاعر کی بیوی بے چاری" بانو ارشد کا ایک خوبصورت اور حقائق سے قریب تر افسانہ ہے۔ افسانے میں موجود واردातیں حقیقی زندگی میں بیشتر شاعروں کا حصہ ہوتی ہیں۔ "مشرق کی لڑکی بے چاری" ____ شاعر کے کسی بھی ایک شعر پر دل ہار دیتی ہے۔ عام طور پر صورتحال کچھ یوں ہو جاتی ہے کہ شاعر موصوف خوبصورت شعر کی بنیاد پر "بے چاری لڑکی" کو

آٹوگراف دے دیتے ہیں۔ بعدازاں یہی آٹوگراف شادی اور بچوں کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ شاعر موصوف تو شعر کی بنیاد پر مصروف رہتے ہیں اور "بے چاری بیوی" بانو کے افسانے کی تصویر بن جاتی ہے۔ افسانہ اس قدر خوبصورت اور حقیقی ہے کہ مزید کسی جملے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ تاہم شاعر کی بیوی کا شکوہ اگر ایک شعر کی صورت میں مزید شامل کردیا جاتا تو بہتر تھا یعنی ۔

دل گیا تھا تو یہ آنکھیں بھی کوئی لے جاتا
میں فقط ایک ہی تصویر کہاں تک دیکھوں

بانوارشد صاحبہ نے اس افسانے کے بعد نوجوان لڑکیوں کو خبردار کردیا ہے، جس کا سو فیصد نقصان اب نوجوان شاعروں کو ہوگا۔

بانو ارشد کے دیگر افسانوں میں "پانوں کی ڈبیہ" نہایت ہی اہم افسانہ ہے، جس کی تعریف متعدد بار میں کراچی کے جید افسانہ نگاروں اور نقادوں سے سن چکا ہوں اور اس کا اظہار یہاں بھی اخبارات اور رسائل میں تبصروں کی صورت میں ہوتا رہا ہے۔ اس کے علاوہ "ایک مسافر ایک فنکار، شادی، جھوٹا بندھن، گلاب کا پھول، مہندی، کانچ کی چوڑیاں، انارکلی، اے لڑکی، آخری باب، چنبیلی کے پھول، سلمیٰ خالہ، اور خوف" ____ بانوارشد کے فن اور شخصیت کو سمجھنے میں اہم افسانے قرار دیئے جاسکتے ہیں۔

عبدالقدوس قادری

بانو کے افسانے

کہتے ہیں کہ گلاب کے نیچے کی مٹی بھی خوشبودار ہوجاتی ہے اور محترمہ بانو ارشد صاحبہ نے اس مثل کو سچ کردکھایا ہے۔ وہ ایک ممتاز اور موقر ادیبہ ہیں اور ارشد تھانوی نیز شوکت تھانوی کے خاندان سے تعلق رکھتی ہیں اور ان کے بڑے بہنوئی عادل رشید اور ہمشیرہ محترمہ عذرا عادل رشید صاحبہ بھی اردو دنیا کی جانی پہچانی ہستیاں ہیں۔ محترمہ عذرا عادل رشید کا رسالہ ''حجاب'' اس صف میں نمایاں مقام رکھتا ہے، جس میں ''عصمت، حور، اور مستورات'' جیسے رسالوں کے نام آتے ہیں۔

محترمہ بانو ارشد نے اپنی منزل خود بنائی ہے۔ وہ خواتین افسانہ نگاروں کی اس کہکشاں کا ایک حصہ ہیں، جس میں قرۃالعین حیدر، آمنہ نازلی، جمیلہ بیگم، ڈاکٹر شائستہ اختر سہروردی، بانو قدسیہ، جیلانی بانو، واجدہ تبسم، عصمت چغتائی کے نام فوراً ذہن میں آجاتے ہیں۔ ناموں اور کارناموں کی یہ فہرست بڑی طویل ہے اور اس کا تذکرہ سردست ضروری بھی نہیں ہے۔ میں اس وقت یہ نام لکھ کر صرف یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ اسی قوس قزح میں بانو کا اپنا انداز اور رنگ نمایاں نظر آتا ہے اور انہوں نے اپنی شناخت بنائی ہے۔

بانو ارشد نے زندگی کا زیادہ سفر دیار غیر میں اور اس ماحول میں گزارا ہے، جہاں زندگی کی قدریں اور طور طریقے مشرقی طور طریقوں سے بالکل مختلف ہیں اور ماحول اور اس سے پیدا ہونے والی صورتحال کی جھلک ان کے افسانوں میں نمایاں نظر آتی ہے۔ اور مغربی نیز مشرقی تہذیب کے تضاد کو انہوں نے نہ صرف محسوس کیا ہے بلکہ اپنے مشاہدات کو سپرد قلم بھی کیا ہے۔ بقول ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد ان کے افسانوں کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ وہ افسانہ نگار خواتین کی اس صف میں داخل ہوچکی ہیں جو اکیسویں صدی میں قدم رکھنے کے لئے پر

تول رہی ہیں۔ "پانوں کی ڈبیہ' سلمیٰ خالہ' اور خوف" میرے خیال میں ان کے بہترین افسانے ہیں۔ ان کے افسانوں کا ایک وصف یہ ہے کہ ان کے زیادہ تر افسانے مکالماتی انداز کے ہیں اور انہوں نے زندگی کی تلخ حقیقتوں کو بے باک اور تیکھے انداز میں بیان کر دیا ہے۔ ان کے افسانوں میں اس کسک کی چبھن کو بھی محسوس کیا جاسکتا ہے جو وطن سے دور زندگی گزارنے والوں کے دل میں پیدا ہوتی ہے۔

"بانو کے افسانے" نام کی کتاب ان کا افسانوں کا خوبصورت مجموعہ ہے۔ کتابت' طباعت اور گٹ اپ سب معیاری ہے۔ اس کو دنیائے ادب کراچی نے شائع کیا ہے' اس میں اکیس افسانے ہیں' قیمت پانچ پونڈ ہے۔ پاکستان سے شائع ہونے والی کتاب پر پونڈ میں قیمت کا درج ہونا کچھ عجیب لگا۔ کاش روپوں میں بھی قیمت درج ہوتی۔ بہرحال یہ کتاب معیاری افسانوں کی کتابوں میں ایک گراں قدر اضافہ ہے' اس کے لئے بانو ارشد قابل مبارکباد ہیں۔

ساحر شیوی

نذرانہ عقیدت

پاک و ہند اور یورپ کی ممتاز ادیبہ اور شاعرہ بانو ارشد کے افسانوں کے مجموعہ "بانو کے افسانے" کی رونمائی کی رسم 6 دسمبر 1996ء کو لندن میں منعقد ہوئی' بدقسمتی سے میں شریک نہ ہو سکا۔ یہ قطعات اسی رسم رونمائی کے لئے کہے گئے تھے۔

مبارک ہو تجھے اے بانو ارشد
ادب کی ہے بلندی پر ترا سر
مبارک رونمائی تیرے فن کی
ہو چرچا اس کا اب دنیا میں گھر گھر

سنوارا تو نے یوں اردو زباں کو
دیا رکنے نہ اس کے کارواں کو
قلم میں اس طرح جادو ہے تیرے
جھکایا ہے زمیں پر آسماں کو

ترے دامن میں اردو کا خزانہ
ترے اشعار میں رنگ زمانہ
ترے ہر لفظ میں روح فصاحت
تری ہر اک ادا ہے شاعرانہ

ادب سے پر ہے تیرا آستانہ
زباں پر تیری اردو کا ترانہ

رہے برطانیہ میں جب تک اردو
نہ بھولے گا کوئی تیرا زمانہ

بزم اردو ادب کی جان ہے تو
بانسری کی حسین تان ہے تو
عمر بھر کی ہے خدمت اردو
یہ ہے سچ اس زباں کی شان ہے تو

آج بانو نے اپنے افسانے
دے دیئے ہیں ادب کو نذرانے
کیوں نہ آئے خمار پڑھ کے انہیں
مئے اردو کے ہیں یہ پیمانے

ثروت اقبال

بانو کے افسانے

کسی شاعرہ یا ادیبہ کے بارے میں اگر کوئی قصیدے کا شاعر یا نقاد کچھ لکھے تو اسے بڑی خوشی ہوتی ہے لیکن اگر یہی کام کوئی ہجو کا شاعر یا طنز نگار کرنے لگے تو بات ذرا تشویش کی ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ایک دفعہ میں نے نور جہاں نوری سے کہا۔ "میں آپ کے بارے میں کچھ لکھنا چاہتا ہوں" تو انہوں نے گھبرا کر میری طرف گھور کے دیکھا اور کہا "کہیں کوئی الٹی سیدھی بات نہ لکھ دینا" اسی طرح جب میں نے یہ بات پروین مرزا سے کہی تو انہوں نے فوراً" کہا "اللہ میں نے ایسی کون سی غلطی کردی ہے" لیکن بانو ارشد کی بات ان دونوں خواتین سے مختلف ہے چنانچہ جب میں نے ان کی کتاب "بانو کے افسانے" پر کچھ لکھنے کے لئے کہا تو انہوں نے کسی تشویش کا اظہار نہیں کیا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ میں ان کا زیادہ کچھ بگاڑ بھی نہیں سکتا ہوں کہ کتاب کے دیباچے ایک پائے کے شاعر اور ایک مشہور افسانہ نگار نے لکھے ہیں۔

حمایت علی شاعر میرے پسندیدہ شاعروں میں سے ہیں۔ ذاتی طور پر میں انہیں نہیں جانتا ہوں لیکن ان کا کلام اپنے زمانہ ء طالب علمی میں مجھے بہت پسند تھا۔ جناب قیصر تمکین برطانیہ کے افسانہ نگاروں میں سب سے ممتاز ہیں۔ نہ صرف وہ ایک بلند قامت ادیب ہیں' بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اردو اور انگریزی دونوں زبانوں کے صحافی بھی رہے ہیں۔ ان دو بلند قامت شخصیات نے جس کتاب کے دیباچے لکھے ہوں' اس میں کچھ نہ کچھ بات تو ہوگی۔

کتاب کے دیباچے اور پیش لفظ میں بہت سے ادیبوں' شاعروں اور ریڈیو پاکستان کے آرٹسٹوں کا ذکر ہے' جن میں سے کچھ سے ذاتی واقفیت اور کچھ سے عقیدت ہے۔ شائستہ

بیزار جنہیں میں شائستہ باجی کے نام سے جانتا تھا۔ وہ کالجوں کے کل پاکستان مباحثوں میں کراچی یونیورسٹی کی نمائندگی کرتی تھیں اور جن مباحثوں میں وہ حصہ لیتی تھیں' ان میں پہلا انعام اور ٹرافی کراچی یونیورسٹی کے لئے وقف ہوجاتی تھی اگر ٹرافی گورنمنٹ کالج لاہور جاتی تھی تو بھی پہلا یا دوسرا انعام شائستہ بیزار کو ہی ملتا تھا۔ شائستہ بڑی اچھی شاعرہ تھیں۔ ان کے یہ اشعار تیس سال بعد اب بھی اتنے تازہ معلوم ہوتے ہیں جیسے اس وقت تھے۔

تم کر کے منزلوں کے تصور سے آشنا
راہوں میں ساتھ دے نہ سکے ایک بار بھی

تنہائی دل کی آج تو اس درجہ بڑھ گئی
لگتا ہے اجنبی سا تمہار دیار بھی

حسینہ معین اور ان کی بہن ملکہ معین ہماری طرح بچوں کے صفحوں میں کہانیاں لکھا کرتی تھیں۔ ملکہ معین کا نام تو اب سننے میں نہیں آتا ہے مگر حسینہ معین کے لکھے ہوئے ٹیلی ویژن ڈرامے بین الاقوامی شہرت رکھتے ہیں۔ ان دونوں خواتین کے ساتھ پڑھی ہوئی شہربانو کا ایک معیاری افسانہ نگار بن جانا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔

میں بانو ارشد سے ایک شاعرہ کی حیثیت سے تو واقف تھا کہ وہ تحریک اردو کے ماہانہ مشاعروں میں پابندی سے شریک ہوتی رہی ہیں۔ ان کے دو ایک افسانے "جنگ" لندن اور "راوی" بریڈفورڈ میں دیکھے تھے مگر ان کی صلاحیتوں کا اندازہ ان کی کتاب "بانو کے افسانے" پڑھ کر ہوا۔

اردو نثر میں افسانہ اور شاعری میں غزل' یہ وہ ایسی اصناف ہیں' جن میں بے شمار لوگوں نے طبع آزمائی کی ہے اور جہاں تعداد بہت زیادہ ہو' وہاں اچھی تخلیق کا انتخاب مشکل ہوتا ہے۔ کیا معیاری تحریر ہے اور کون سی تحریر معمولی ہے' اس کا تعین پڑھنے والے ہی کر سکتے ہیں۔ شہرت بھی ایک معیار ہو سکتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر شہرت یافتہ ادیب اور شاعر کی تخلیق معیاری ہو۔ بہت سے پائے کے قلم کار گمنام رہ جاتے ہیں۔ اگر ان معیاروں پر دیکھا جائے تو بانو ارشد کو درمیانہ درجے کا افسانہ نگار کہا جا سکتا ہے۔ درمیانہ درجے کا اس وجہ سے بھی کہ عصمت چغتائی' قرۃ العین حیدر اور حاجرہ مسرور کے مقام تک پہنچنے کے لئے بہت محنت کی ضرورت ہے۔

"بانو کے افسانے" بانو کی پہلی کتاب ہے لیکن برطانیہ اور پاک و ہند کے ادبی حلقوں میں ان کا نام جانا پہچانا ہے کیونکہ ان کے افسانے اخبارات اور رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ صاحب کتاب ہونے کے بعد ادب میں ان کا قدم بڑھا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ پڑھنے والوں میں ان کی کتاب کتنی مقبول ہوتی ہے اور نقادوں میں ان کی کیسی پذیرائی ہوتی ہے۔

ایک اچھے افسانے کی خصوصیت یہ ہے کہ اسے ختم کرنے کے بعد پڑھنے والے کے ذہن میں ایک تاثر باقی رہ جاتا ہے' اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کے کردار اور ماحول پڑھنے والے کے لئے مانوس ہو لیکن اتنا قریبی بھی نہیں کہ اس میں کوئی کشش بھی باقی نہ رہے۔ اگر اس لحاظ سے دیکھا جائے تو بانو کے افسانوں کے کردار اور ماحول ہمارے گرد و پیش کا ہے۔ ان میں کہانی بھی ہے اکثر افسانے مختصر ہیں' غیر ضروری طوالت سے گریز کیا ہے اور نہ ہی بہت زیادہ اختصار سے کام لیا ہے۔ افسانہ نگار نے فلسفی بننے سے گریز کیا ہے اور واقعات کو جیسے ہوتے ہیں ویسے لکھا ہے اور اس بات کی کوشش نہیں کی کہ انہیں کیسے ہونا چاہئے تھا۔ زبان عام فہم اور سلیس ہے۔ غیر ضروری انگریزی الفاظ استعمال نہیں کئے ہیں جیسا کہ آج کل کے اکثر لکھنے والوں کا طریقہ ہے۔

برطانیہ کے افسانہ نگاروں میں اکثریت خواتین کی ہے۔ اچھے افسانہ لکھنے والوں میں فیروزہ جعفر' فیروز مکرجی' نجمہ عثمان' پروین مرزا' محسنہ جیلانی' صفیہ صدیقی اور بانو ارشد کے نام آتے ہیں' ان میں بانو ارشد کا نام بڑا نمایاں ہے۔ مرد اس معاملے میں خواتین سے ذرا پیچھے رہ گئے ہیں۔ سوائے قیصر تمکین اور مقصود الٰہی شیخ جن کے افسانے بڑے معیاری ہوتے ہیں کے علاوہ مرد افسانہ نگاروں کی تعداد خواتین کے مقابلے میں بہت کم ہے۔

کتاب کی مقبولیت میں اس کے متن کے علاوہ اچھی طباعت' جلد بندی اور ٹائٹل کا بھی دخل ہوتا ہے اور اگر اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ کتاب ایسی ہے جسے ہاتھ میں لینے اور پڑھنے میں لطف آتا ہے۔

اس کتاب میں "پانوں کی ڈبیہ' کانچ کی چوڑیاں' اور معصوم گناہ" تکنیک کے اعتبار سے بہت اچھے ہیں اور پڑھنے والوں کے ذہن میں ایک گہرا تاثر چھوڑ جاتے ہیں۔ "مہندی' شاعر کی بیوی بیچاری' اور کٹی پتنگ" کو اوسط درجے کے افسانے کہا جاسکتا ہے۔

"بانو کے افسانے" بانو ارشد کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے، جس میں ان کے اکیس افسانے شامل ہیں۔ تمام افسانے اپنے اسلوب اور انداز بیان کے اعتبار سے بے حد سادہ اور اپنے اندر ابلاغ کی تمام تر خصوصیات لئے ہوئے ہیں۔ بظاہر یہ برطانوی معاشرے میں بسنے والی ایشیائی کمیونٹی کے حقیقی مسائل پر مبنی چھوٹی چھوٹی سچی کہانیاں لگتی ہیں، جن میں پامال ہوتی ہوئی اخلاقی اقدار، ذہنی انتشار سے دوچار ہونے والی نئی نسل کی نفسیات اپنی مٹی سے بچھڑ جانے کے دکھ اور اپنے جیون ساتھی سے جدا ہو جانے کا احساس اور دیگر گھریلو زندگی کے مسائل سے لے کر محروم تمناؤں کا اظہار ایک حوالے کے طور پر پڑھنے کو ملتا ہے۔ بانو ارشد کی کہانیوں کے موضوعات اگرچہ نئے نہیں ہیں لیکن انہوں نے مغربی ماحول میں ان کو نئے زاویہ نگاہ سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے افسانے "شادی ایک جھوٹا بندھن" اور "طاقتور کون" یقیناً" پڑھنے والے کو نئے پن کا احساس دلاتے ہیں۔ اسی طرح ان کا افسانہ "ننھی مفکر" اپنے موضوع اور انداز بیان کے اعتبار سے ایک بالکل مختلف کہانی ہے۔ بانو ارشد نے اپنی کہانیوں میں کہیں بھی کسی علامتی یا تجریدی حوالے کا سہارا نہیں لیا۔ انہوں نے عورت ہونے کے ناطے جس چیز کو جس طرح دیکھا اور جس طرح محسوس کیا بالکل ویسے ہی بیان کردیا ہے۔ ان کے افسانوں کے مختلف کرداروں کی گفتگو کو مکالے کی شکل دی گئی ہے، جس کی رو سے ان کے افسانوں کا قاری "بانو کے افسانے" پڑھتے وقت یوں محسوس کرتا ہے کہ جیسے سب کچھ اس کے سامنے ہورہا ہے اور وہ ان افسانوی کرداروں کو اپنے تصوراتی منظرنامے میں ایک ڈرامائی شکل میں ایک دوسرے سے مخاطب ہوتے ہوئے دیکھتا ہے۔ حمایت علی شاعر نے "بانو کے افسانے" پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "بانو کے افسانے" بکھری ہوئی داستانوں کے اوراق ہیں۔ اس نے عورت ہونے کے ناطے عورتوں کی کہانیاں لکھی ہیں، ان میں مشرقی تہذیب کے پس پردہ خاموش المیوں سے لے کر مغربی معاشرے کی آنکھوں کو اندھا کردینے والی چکاچوند تک کئی ایسی حقیقتیں سانس لیتی ہیں جو اکیسویں صدی میں ہمارے نئے سماجی رویوں کی آئینہ دار ہوں گی اور ہمیں نئے انداز میں سوچنے پر مجبور کردیں گی۔"

برطانیہ میں آباد اردو کے ادیبوں اور شاعروں پر اکثر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ وہ اس ماحول میں رہ کر اس معاشرے کے مسائل کو اپنی تخلیقات کا موضوع نہیں بناتے مگر بانو ارشد کے بیشتر افسانوں کا موضوع برطانوی زندگی اور اس کے المیے سے متعلق ہے، جس کے باعث برطانیہ میں رہنے والا اردو ادب کا قاری اُن کے افسانوں کو کسی اجنبی ماحول کا تخلیقی حوالہ نہیں سمجھتا۔ ممتاز افسانہ نگار قیصر تمکین ان کے افسانوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"بانو ارشد کی حالیہ کہانیوں پر حقیقت نگاری کا غصہ اچھی طرح اور سنبھل سنبھل کر آرہا ہے۔ اس مجموعے کی کہانیوں کے مطالعے سے ان کے ذہنی سفر اور خوب سے خوب تر کی سعی پیہم کا اچھا اندازہ ہوجاتا ہے۔ انہوں نے اب تک جو سفر طے کیا ہے، وہ ایک اچھا اور خوشگوار سفر ہے۔ وہ ابھی تک کسی گھنی چھاؤں کا بہانہ بنا کر ستانے کے لئے نہیں بیٹھیں، اس لئے یہ امید کرنا بالکل جائز ہے کہ وہ اپنے چنے ہوئے راستے کو طویل سے طویل تر بنانے میں کوشاں رہیں گی۔"

بانو کے افسانے برطانوی زندگی کے حوالے سے اردو ادب کے قاری اور نقاد کے لئے یقیناً" توجہ کے مستحق ہیں، جنہیں برطانیہ میں اردو افسانے کی تاریخ لکھتے وقت نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔

فیضان عارف

Bano's Short Stories

Bano Arshad

Bano's stories become a feast for celebrating the extension of her experience. of living in the West. instead of becoming self-pitying monologues of a lamenting heart pining to drift back into the past. While she draws from the stunning paradoxes of modern life. she finds her pen equally entitled (and eager) to slide into the past or perhaps even present of the sub-continent. to draw from what constitutes her in-genious mindscape.

Salman Asif